بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلسلہ مطبوعات انجمن اسلامی تاریخ و تمدن (۹)

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ

تمدنِ اسلام

کی کہانی، اسی کی زبانی

یعنی

مفسر قرآن حضرت مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی مدظلہ العالی

کا وہ بصیرت افروز مقالہ جو انھوں نے

انجمن اسلامی تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کے زیر اہتمام اسلامی ہفتہ کے چوتھے عظیم الشان اجتماع میں بمقام اسٹریچی ہال پڑھا

اور حسب ایماء

جناب ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی نائب صدر انجمن مذکور

حامد اللہ انصاری معتمد نشر و اشاعت

نے

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع کرا کر شائع کیا

بار اوّل جلد ایک ہزار

پیش لفظ

انجمن اسلامی تاریخ و تمدن کا نواں شاہکار "تمدن اسلام کی کہانی" حاضر خدمت ہے۔ یہ عام قصے کہانیوں کی طرح سے نہیں ہے، جن کا مقصد خواب گوری ہوا کرتا ہے، بلکہ یہ ایک پیغام بیداری اور تریاق فاروقی ہے ان مسلمانوں کے لئے جو عرصۂ دراز سے غفلت کی گہری اور زہریلی نیند سو رہے ہیں ——— اس لئے کہ یہ مرقع ہے رشد و ہدایت کا، پیکر ہے قرآنی حقایق کا، اور مبارک نتیجہ ہے ایک بیدار کاوش و بلند فکر کا بشرطیکہ کوئی پڑھے، سوچے اور سمجھے! - پس یقین ہے کہ اس کا عمیق مطالعہ مالا مال کردے گا نور ایمانی سے، معارف فرقانی سے اور روشناس کردیگا سرور کائنات کے اسوۂ حسنہ سے۔

یہ بلند پایہ مقالہ مفسر قرآن، متکلم اسلام حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدظلہ العالی نے اسلامی ہفتہ کے چوتھے عظیم الشان اجتماع میں بمقام اسٹریچی ہال بتاریخ ۲۹ راکتوبر ۱۹۴۱ء پڑھا۔ مقالہ نگار کے تبحر علمی، زہد باطنی، تقدس اور کمال علم و فضل اور اسلامی ہفتہ کی بانی، مقالہ ہذا کی ناشر باہمت جماعت سے آپ بخوبی واقف ہیں اس لئے اپنی تمام تر توجہ پیش نظر مقالہ پر مرتکز کیجئے اور گوش دل سے اسلام کی کہانی اسی کی زبانی سنکر بہرہ اندوز ہوجیئے۔

محمد حامد اللہ انصاری عفی عنہ
معتمد اعزازی شعبۂ نشر و اشاعت۔

انجمن اسلامی تاریخ و تمدن
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۱۵ر محرم الحرام ۱۳۶۱ ہجری

تمدّن اسلام کی کہانی

اسی کی زبانی

دینی بھائیو اور عزیزو!

بچپن کی بات، بیہوشی کا زمانہ، تاریخ کی پیدائش سے بھی قبل کا دور،

ع بھولا ہوا سا خواب ہے کچھ ہے خیال کچھ نہیں

یاد اتنا ضرور آتا ہے کہ جب اپنی آنکھ اس گوشت پوست کی دنیا میں اسس آب وخاک کے کارخانہ میں کھلی، تو دیکھا کہ سر پر سایہ دو خاک کے پتلوں کا ہے۔ ایک کا نام باوا آدم، دوسرے کا ماما حوّا۔ یہ لوریاں دے رہی ہیں، وہ سر پہ شفقت کا ہاتھ پھیر رہے ہیں۔ کچھ پیاری پیاری نورانی صورتیں اور بھی دھندلی سی یاد پڑ رہی ہیں۔ فرشتہ شاید انہیں کو کہتے ہیں۔ ایک دفعہ باوا آدم نے کان میں کچھ ایسے انچھر پھونکے، کہ دل میں اتر گئے، حافظہ میں گڑ گئے۔ آج تک ازبر کیے "جان پدر! تم اولادِ معنوی ہو، اللہ تمہارا اقبال بڑھائے، میری صلبی اولاد کو سدا تمہاری راہ چلائے۔ لیکن تقدیر کے نوشتہ کو کون میٹ سکا ہے؟ لکھا [illegible] ہے کہ تمہاری زندگی اوّل سے آخر تک ایک موذی سے مقابلہ میں گذریگی میں کٹیگی، گو تمہارے اصلی جوہر بھی اسی مقابلہ سے چمکیں گے، اصلی کمالات اسی اُبھریں گے۔ میرا اور تمہارا ازلی دشمن، نام ابلیس، حسد کی آگ کا پتلا۔ کھل کر سامنے نہ آئیگا۔ حملہ ہمیشہ آڑ سے کریگا۔ کہیں یہ روپ بھر کر، کبھی وہ نقاب چہرہ پر ڈال کر، اسکا لشکر بے شمار، اس کے چہرے کے نقاب بے حساب۔ لیکن غم نہ کرنا، اسکی نیرنگ سازیوں

سے ذرا نہ ڈرنا۔ انجام کار فتح تمہاری ہی مقدر ہے"——— باوا آدم کی وصیتوں سے
تو بس اسی قدر حافظہ میں ہے۔ ہاں خوب یاد پڑ گیا۔ اسی دور کا ایک حادثۂ خونین
نظروں کے سامنے اس طرح پھر رہا ہے، کہ گویا کل ہی کی بات ہے! ایک دن ہوا کیا
کہ میں بھائی ہابیل کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے معصومیت کے کھلے ہوئے چمن میں گشت
کر رہا تھا کہ اتنے میں قابیل نے عفریتی حربہ سے وار کر دیا۔ ہابیل غریب کا تو خیر کام ہی
تمام ہو گیا، لیکن میرے جسم نے بھی زخم کا خراش اور اس کا مزہ پہلی بار چکھ جانا!

دن گزرے، اور گزرتے رہے سال شروع ہوئے اور ختم ہوتے رہے
صدیوں بعد، کوئی ۳۰۰۰ سنہ ق۔م کے لگ بھگ میں نے اپنے کو سطح زمین کے اس
خطہ میں جہاں دریائے فرات بہہ رہا ہے یعنی دیار بکر اور بغداد کے درمیان، اور یہیں کچھ
دور پر سلسلۂ کوہستان ارارا ط واقع ہے۔ اور اس کی ایک چوٹی کا نام جبل جودی ہے
جھیل وین ([illegible]) کے جنوب و مغرب میں اس وقت تک اولادِ آدم سارے روئے
زمین پر نہیں پھیل پائی تھی بلکہ سب کا مسکن یہی علاقہ تھا۔ قوم کی قوم کو دیکھا کہ اچھے خاصے
ہوشیار تمیزدار، دیکھنے میں عاقل و فرزانہ، لیکن مجھ سے سب کے سب بیگانہ۔ دل سب
کے میری طرف سے پھرے ہوئے اور خیر میں تو کیا چیز ہوں، چہرے میرے مالک و مولیٰ
کی طرف سے مڑے ہوئے! حرکت کیا کی کہ مجسمے بنائے اپنے بڑوں کے، سرداروں
کے ناموروں کے۔ اور پہلے تو اس کا نام محض یادگار رکھا لیکن تعظیم کے ڈانڈے
پرستش سے ملے ہوئے جو ٹھہرے! لگے انہیں کے آگے اپنی حاجتیں پیش کرنے، انہیں
سے اپنے دکھ سکھ میں سوال کرنے۔ اگلی نسلیں گزرتی گئیں، اور نئی نسلوں نے ان
سے وہ معاملہ شروع کر دیا، جو بندوں کا ہوتا ہے خدا کے ساتھ، مخلوق کا خالق کے ساتھ۔
گویا پتھر کی مورتیاں ان کے عقیدہ میں شریک تھیں خدا کی خدائی میں، حاکم و متصرف
تھیں خلق کی حاجت روائی میں ——— عقلمندوں نے اتنا نہ سوچا، کہ جو باور اہے

جسم و قالب سے، وہ بھلا کہیں صورت پکڑ سکتا ہے اور جو منزّہ ہے قید و تعین سے وہ بھلا گرفت میں آسکتا ہے کسی مصور کے، نقاش کے، سنگتراش کے!

ایک مردِ خدا نوحؑ بن لامک نامی اسی سرزمین سے اٹھا اور پکار پکار بولے، کہ "میرے بھائیو، یہ کیا اندھیر ہے! بلا کی حماقت، اور انتہا کی شامت، کہ بندوں کو درجہ خدا کا دیتے ہو اور جو محض بے بس ہے اسے قدرت والا سمجھتے ہو" تہذیب و شائستگی، عقل و خرد کے مدعیوں نے جواب اس وقت بھی وہی دیا جو آج دے رہے ہیں۔ بولے "تم ایک خشک و بے مغز شخص کیا قدر جانو ہمارے ان فنون لطیفہ کی؟ یہ مجسمہ تراشنا، انہیں نمایاں مقامات پر نصب کرنا تو عین تہذیب و ورشپ ہے، دلیل اور علامت ہے ملّی زندگی کی یہ شرک و معصیت کا قصہ تم نے کہاں سے نکال لیا؟" اس زمانہ کا اوسط عمر آج سے کہیں بڑھا ہوا تھا۔ مقدس بندہ نوح نے اس بڑھے ہوئے معیار سے بھی کہیں بڑی عمر پائی۔ نیچے سے ایک عظیم الشان سیلاب امڈا، اور اوپر سے بارش ہوئی موسلا دھار۔ مخالفین، معاندین سب کے سب ڈوب کر رہ گئے۔ بس نوح اور ان کے مخلصین باقی بچ گئے۔ اشارۂ غیبی پاکر حفاظت کا سامان ایک طویل و عریض کشتی کے ذریعہ سے پہلے ہی سے کر لیا تھا۔

اس طوفان عظیم کے نفس وقوع سے تو تازہ ارضیاتی (جیولاجیکل) اور اثری (آرکیولاجیکل) شہادتوں کے بعد بیسویں صدی کو انکار کی گنجائش رہی نہیں ہے۔ البتہ ہنسی آجاتی ہے جب لوگوں کو اعتراض و انکار کے لہجہ میں کہتے سنتا ہوں کہ "طوفان مقامی ہو تو ہو، عالمگیر نہیں ہوسکتا" بیشک طوفان زمین کے سارے حصہ پہ محیط نہ تھا، اور کیوں ہوتا مقصود تو صرف خطاکاروں کو غرق کرنا تھا۔ اور وہ خطاکار قوم صرف قوم نوح تھی لیکن اس ایک خطہ کے سوا اور اولاد آدم اس وقت تھی ہی کہاں؟ پس اگر قوم نوح غرق ہوئی تو اس کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ اس وقت کی

ساری دنیائے انسانیت غرق ہوگئی!

دنیا کی عمر کچھ اور کھسکی۔ اور چند صدیاں ابھی اور گذریں تھیں، کہ اسی سرزمین پر ایک قوم اور ابھری تہذیب و تمدن میں اگلوں سے بھی بڑھی ہوئی۔ ستارہ شناسی کے علم میں طاق ہسنگ تراشی کے فن میں شہرۂ آفاق۔ ان کے درمیان ماہرین فن کا ہجوم صنعت گروں کی دہوم۔ مورتیں اس صفائی اور صناعی سے بناتے کہ نقل کو اصل کر دکھاتے۔ بیجان میں گویا جان ڈالدیتے۔ ترقی کا قدم سائنس اور آرٹ کی توان بلند منزلوں میں اور عقاید کی پستیوں کا یہ حال کہ مندر سورج دیوتا کے بنے ہوئے اور خلیفۃ اللہ انسان کے ماتھے چاند اور تاروں کے آگے سجدوں میں گرے ہوئے۔ مورتی پوجا اپنی شباب پر۔ گویا شرک کا وہی مذہب جو ہندوستان میں آج بھی رائج ہے۔ ملک وہ تھا جسے عراق کہتے ہیں۔ کبھی بابل کہا جا چکا ہے اور کبھی کالڈیا یا کلدانیہ۔ اس وقت ہندوستان سے کچھ ایسا دور بھی نہ تھا، بلکہ خیال تو کچھ ایسا پڑتا ہے کہ سندھ کی سرحدیں اس سے ملی ہوئی تھیں، اور درمیان میں یہ سمندر حائل نہ تھا اسی قوم میں میرے وہ زبردست مربی پیدا ہوئے جنہوں نے پھیکا کر دیا باوا آدم کی بھی شفقتوں اور نوازشوں کو۔ نام ابراہیم یا ابرہام۔ والد کا نام تارح یا عربی تلفظ میں آذر تھا۔ یہ ابراہیم موحد نہیں موحد گر تھے۔ موحدوں کے سردار تھے۔ شرک کا رنگ دیکھ تاب کہاں لا سکتے تھے تبلیغ کی اور خوب ہی کی، توحید کے دین کی توحید کے تمدن کی، توحید کی تہذیب کی۔ تہذیب جاہلی ان سے گتھ گئی۔ حکومت اس کی نصرت پر، سوسائٹی اسکی حمایت پر۔ کوئی طریقہ جور و ستم کا ان پر اٹھا نہ رہا۔ حد یہ ہے کہ دہکتی ہوئی آگ میں زندہ جھونک دیئے گئے۔ زندگی جس کے حکم کے تابع ہے۔ اسی کے حکم سے زندہ نکل آئے۔ آخر ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ عراق سے شام پہنچے۔ اور شام سے چلے تو فلسطین اور مصر سے گذرتے ہوئے حجاز میں آن کر ٹھہرے۔ جہاں کہیں بھی پہنچے غلغلہ بلند کرتے

رہے میرے دین کا، جدھر سے بھی گذرے جھنڈا لہراتے گئے میرے آئین کا۔ مکہ پہنچے تو باپ بیٹے نے مل کر وہ مکان کھڑا کر دیا" جو آج تک مرکز چلا آ رہا ہے توحید کے دین کا' اہل توحید کے آئین کا۔

کچھ اور بعد عرب کے جنوب و مشرق میں قوم عاد آباد رہی، اور پھر انکے بعد شمال و مغرب میں قوم ثمود۔ دونوں کا اپنے اپنے زمانہ میں خوب زور رہا۔ تنومند، زور آور، قد آور لوگ تھے۔ اپنے تہذیب و تمدّن پر نازاں۔ انجینری، صنعت کاری، ہندسہ کے فن کے بادشاہ، پتھر کے جگر پر شگاف دیتے، اور پہاڑوں کو کاٹ کر محل تعمیر کرتے، میری ان کی آویزش قدم قدم پر رہی۔ ان کی تہذیب جاہلی، میری تعلیم توحیدی۔ انکے ہاں سفر حیات کی ہر منزل پر اخلاق کی گندگی اور باطن کی سیاہی۔ میرے ہاں زندگی کی ہر سانس پر جلا اور قلب کی صفائی، دعوی ادہر قوت کا اور کثرت کا، بھروسہ ادھر صداقت کا، وحدت کا۔ میرے علمبرداروں نے صدمے بڑے بڑے اٹھائے، دکھ جھیلے سہے۔ آخر میں فتح میری ہوئی۔ اور تختہ الٹ کر رہے قوت کا زعم رکھنے والوں کے، کثرت پر ناز کرنے والوں کے۔ اور یہی انجام ہر جاہلی تمدّن کا ہو کر رہتا ہے۔ شرک کی اعتقادی اور فسق کی عملی گندگیوں سے لبریز تمدّن کو تباہی اور ہلاکت سے بچا لیجانیوالی نہ کوئی سپاہ آج تک دریافت ہو سکی ہے نہ کوئی قلعہ ـــــ ان دونوں قوموں سے قبل، اور قوم ثمود سے کچھ ہی فاصلہ پر اس کے شمال و مشرق میں جہاں آج شرق یردن کا علاقہ ہے۔ ایک اور قوم آباد تھی۔ اپنے مصلح حضرت لوط کی جانب منسوب۔ اس کے تمدّن کے غیر صالح، نا سزا عناصر کی ناپاکیاں، خدا کی پناہ! بالآخر ملیا میٹ ہو کر رہی۔ اور اب تو ایک نامور ماہر اثریات سر چارلس مارسٹن نے اسکا زمانہ تک بالکل متعین کر دیا۔ ۲۰۶۱ سنہ قبل مسیح۔ اسکی یادگار رہا کی نہ سہی آبی، آج بھی عرب و شام کے درمیان بحر مردہ

(Dead Sea) کی شکل میں دیکھی جا سکتی ہے! اس جھیل یا بحیرہ کے اوپر اور اندر بھی چار ہزار سال گزر جانے پر آج تک موت ہی کی عملداری! نہ اندر کوئی مچھلی زندہ رہکر سانس لے سکے نہ اوپر کسی پرندہ کی مجال کہ پر مار کر گزر سکے! عذاب الٰہی کی بے پناہی! معاذ اللہ!

ان سب کے بعد اور ان سب کے علاوہ ایک اور قوم بھی گذری ہے حضرت مسیح سے کوئی ۱۶۰۰ سال قبل۔ علمبردار توحید شعیب نبی کی جانب منسوب۔ تجارت پیشہ کاروباری لوگ آباد تھے علاقہ مدین میں خلیج عقبہ کے متصل مصر، فلسطین، عرب، اور بحر روم بحر قلزم کے بیچ راہ پر۔ ان کی تہذیب میں جائز تھا دوسرے کا حق مار لینا، اپنا نفع غبن فاحش کے ساتھ حاصل کرنا، غرض تجارتی معاملات میں ہر قسم کی چالاکی اور خیانت۔ میری ان سے بھلا کیا بنتی! خوب مقابلے رہے۔ یہاں تک یہ قوم بھی فنا کے اسی گھاٹ اتر گئی، جہاں ان سے قبل ان کے بہت سے پیشرو پہنچ چکے تھے۔

اب نمبر آتا ہے مصر کا۔ یہاں میرے قدم یوسف صدیق کے عہد میں ۱۸۷۰ ق۔م ہی میں پہنچ چکے تھے اور ان کی زندگی بھر میری ہی حکمرانی رہی۔ لیکن چند روز بعد جب سلطنت بدلی، تو قوم کا نظام بھی بگڑا۔ اور ہوتے ہوتے تین چار سو برس کے عرصہ میں تو تہذیب جاہلی پورے زور شور کے ساتھ خم ٹھونک کر میرے مقابلہ پر آ گئی۔ حکومت اب اس تاجدار کے ہاتھ میں تھی، جو اپنے کو بندہ نہیں، بندوں کا آقا، بندوں کا رب سمجھ رہا تھا۔ معبود اکبر سورج دیوتا" یا "راع" کے اوتار اور انسانی قالب میں خدا یا "فرعون" (یعنی "راع" کے نمائندے) تو یہاں کے فرماں روا عرصہ سے سمجھے جا رہے تھے (جیسے ہزاروں برس کے بعد آج بھی میکاڈو شاہ جاپان سمجھے جا رہے ہیں) لیکن اب جو بادشاہ مصر کا ہوا، اس کا نمبر فساد عقیدہ و فساد عمل دونوں میں سب سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ میری زبان تھے اس وقت موسیٰ کلیم اللہ اور میرے ترجمان ہارون نبی اللہ۔ دونوں نے اپنی والی سب ہی کچھ کر چھوڑی۔ تبلیغ

کا حق ادا کر دیا۔ نا سمجھ اور مشرک مزاج خلقت، دلائل سے زیادہ گرویدہ خوارق و معجزات کی ہوتی ہے۔ خالق بے نیاز نے دونوں بزرگ بندوں کے ہاتھوں اس طرح کے کرشمے بھی نہ معلوم کتنے دکھا ڈالے۔ پتھر میں جونک نہ لگنا تھی نہ لگی۔ جابر و قاہر حکومت کا غیظ و عناد بڑھتا ہی گیا۔ نتیجہ جو کچھ بھی نکلا تاریخ کے صفحات پر ثبت ہے۔ مظلوم بنی اسرائیل نے چاہا کہ اپنے وطن فلسطین کو چلے جائیں، قاہرہ[1] کے قاہر کی مصلحتیں سد راہ رہیں۔ آخر ایک روز رات کے وقت موقع پا کر بنی اسرائیل نکل کھڑے ہوئے، مرد عورتیں، بوڑھے، بچے سب۔ آجکل کی سی کوئی پکی صاف سیدھی سڑک لگی ہوئی تو تھی نہیں، رات کا وقت، تعاقب کا خوف اور گھبراہٹ، راستہ بھول گئے اور بجائے شمال کی طرف ذرا اور آگے بڑھ کر پھر مشرق کی طرف مڑتے کے پہلے ہی ادھر مڑ گئے۔ اب جو دیکھا تو سامنے سمندر یعنی بحر قلزم (Red Sea) کی شمالی مغربی آبنائے، جس کے بعد ہی اب نہر سویز شروع ہو جاتی ہے، اور اس وقت خشکی تھی واپس ہونا چاہا تو دیکھتے کیا ہیں، کہ خود ہز امپیریل میجسٹی فرعون لاؤ لشکر کی کمان کرتا ہوا بھاگو بھاگ چلا آ رہا ہے۔ اب اسرائیل غریب کریں تو کیا کریں؟ دائیں اور بائیں پہاڑ، سامنے سمندر، اور پشت پر یہ لشکر جرار! جو توحید والے تھے انہیں اشارۂ غیبی ہوا کہ بے تکلف سمندر میں کود پڑو وہ کود پڑے۔ اور اسے اب زلزلۂ بحری کا اثر سمجھیے یا جو بھی تعبیر اختیار کیجئے، بہرحال سمندر پھٹا، ان کے لئے راستہ بن گیا۔ اور وہ بخیریت اتنا حصہ عبور کر کے جزیرہ نمائے سینا کی خشکیوں پر آ گئے ادھر فرعون نے اپنے لشکریوں کو للکارا کہ دیکھتے کیا ہو، ڈال دو تم بھی اسی طرح ان کے پیچھے سمندر میں

---

[1]: مصر کا یہ موجودہ دار السلطنت تقریباً اسی جگہ آباد ہے جہاں فرعون کے زمانہ میں بنی اسرائیل کی آبادی تھی۔ محلہ جاشان یا انگریزی تلفظ میں Gashan ۔

اپنے فوجی رتھ[۲] اور گھوڑے۔ فرعونیوں کا سمندر کے بیچ بیچ پہنچنا تھا کہ پانی کی پہاڑ سی کھڑی ہوئی دیواریں آپس میں مل گئیں، اور وہ فرعون جو "بے سامان" نہیں باسامان تھا مع اپنے سارے ساز و سامان کے غرق ہو کر رہ گیا۔ یہ واقعہ عجب نہیں کہ ۱۴۸۰ء قبل مسیح میں واقع ہوا ہو۔

اب میرا قیام سالہا سال تک جزیرہ نمائے سینا میں رہا۔ موسیٰ علیہ السلام پر پوری شریعت اسی زمانہ میں اتری اور انہوں نے میری حکومت ایک ایک جزوی تفصیل کے ساتھ اپنی قوم پر پھیلانی چاہی۔ خود قوم والے مخالف ہو بیٹھے۔ مخالفت کا لیڈر قوم ہی کا ایک بڑا سیٹھ، ساہوکار یا بینکر تھا۔ قارون نام۔ اس کی بے انداز دولت کی تفصیل بیان ہو، تو کتنوں کو آج افسانہ معلوم ہو، اتنی زائد دولت کا ایک ہی جگہ اجتماع، پھر اس کے حاصل کرنے کی حرص، اور اس کے خرچ کرنے میں بخل۔ بھلا یہ چیزیں میرے ساتھ کبھی جمع ہو سکتی ہیں، جواب ہوتیں؟ فرعون تو خیر دولت ایمان ہی سے محروم تھا، قارون بدبخت تو خاص مومنوں کے درمیان پیدا ہو کر، ان کے درمیان پل کر، بڑھ کر پھر انہیں سے بغاوت کر نکلا!

ٹیڑھا لگا تھا قط قلم سر نوشت کو!

انجام یہ ہوا کہ خود مع اپنے سارے سرمایہ کے زمین میں دھنس گیا!۔ وقت کے ایک اور بدنصیب سامری نامی نے تو غضب ہی کر دیا۔ حضرت موسیٰ کی چند روزہ غیر حاضری میں ظالم نے بنی اسرائیل کے عقائد ہی مسخ کر دیئے۔ اور جو توحید کی شاہراہ کے مسافر تھے، انہیں بت پرستی کی بھول بھلیاں میں الجھا دیا! مقصد گزارش یہ کہ غیر تو غیر، مجھے خود اپنوں کی بھی سرکشی، تمرد و بغاوت کا مقابلہ بار ہا کرنا پڑا ہے۔

داؤد نبی (متوفی ۹۶۳ ق۔م[۳]) اور سلیمان پیغمبر (متوفی ۹۳۲ ق۔م[۴]) کے نام آپ نے سنے ہوں گے۔ شام و فلسطین میں ولادت مسیح سے کوئی ایک ہزار سال

ع۲۔ فوجی رتھیں اس زمانے کے سامان حرب کا اہم ترین جزو تھیں۔ ۳۔۴ یہ دونوں سنہ سرچارلس مارسٹن کی تازہ تحقیق کے مطابق ہیں۔

قبل میرے ہی نمائندے تھے۔ اللہ کے پیمبر با وقار بھی اور دنیا کے نامی گرامی تاجدار بھی ایک طرف صاحب زہد و تقویٰ دوسری طرف فاتح اور کشور کشا ایک طرف نظر میں مثال ان کی رکھیئے نیز مصر کے وزیر مال اور وزیر اعظم یوسف نبی کی اور دوسری طرف غریب و بے زر انبیا اور مفلس و تہیدست اولیاء الٰہی کی ان دونوں سروں کا وجود ثبوت ہے۔ اس کا کہ میری ذات پابند نہ غربت کی نہ امارت کی، نہ افلاس کی نہ بادشاہت کی میری روح، میرا جوہر، میرا مایۂ حیات جو کچھ ہے، عدل ہے، اعتدال ہے، توازن ہے۔ ادائے حقوق ہے احساس عبودیت ہے۔ میں امیروں کے شیش محل میں جب آنکلتا ہوں تو شکر کا مظہر بن کر۔ اور غریبوں کے جھونپڑے میں جب گزر کرتا ہوں تو صبر کا پیکر بن کر۔ عیش میں خوف خدا کا نقیب ہوں، فقر میں یاد خدا کی ترغیب ہوں۔ زرداروں کو ڈراتا ہوں کہ دولت و ثروت کے اس خزانہ سے حساب پائی پائی کا دینا ہوگا۔ ناداروں کو سمجھاتا ہوں کہ اصل دولت قناعت کی تو تمہیں کو نصیب ہے۔ نہ میرا یارانہ کیپٹلزم سے نہ میری دوستی کمیونزم سے میں دونوں کی بے اعتدالیوں کا زیادتیوں کا مخالف۔ اور اگر خوبیاں ان میں سے کسی میں ہیں تو وہ میرا ہی عین پرتو ہیں!

اُدھر باہر یہ سب کچھ ہوتا رہا، اِدھر آپ کا ہندوستان بھی خاموش اور معطل نہیں رہا، نئے نئے مذہب، نئے نئے فلسفے اور ان کے ماتحت نئے نئے تمدن یہاں بھی پیدا ہوئے اور فنا ہوتے رہے صدائے توحید بھی بیشک کبھی کبھی اٹھی لیکن عام روش وہی مشرکانہ قوموں والی یہاں بھی جاری رہی۔ تناسخ کے عقیدہ کا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ذاتی سعی کی اہمیت جاتی رہی اور انفرادی عمل کی معنویت بالکل بے معنی رہ گئی۔ دار مدار "کرم" ٹھہرا یعنی پچھلے جنم کا ثمرہ اعمال۔ گویا اگر آج کوئی

شرابی ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ ارادۃً شراب پینے کی معصیت کر رہا ہے، بلکہ اس لئے کہ "کرم" یعنی پچھلی زندگی کے اعمال کے مطابق شرابی ہونا ہی تھا۔ ورن آشرم" کے عقیدہ نے وحدت انسانی کا تخیل ہی پاش پاش کر دیا۔ اب انسان محض کے کوئی معنی ہی نہیں رہے۔ اور خدا کی بنائی ہوئی انسانی وحدت تقسیم ہو گئی انسان کی گڑھی ہوئی چار ذاتوں میں اور پھر ان کی بیشمار شاخوں میں۔ برہمن، چھتری، ویش، شودر، یہ چار مستقل سانچے ہر فرد کے لئے اس کی پیدائش ہی کے وقت سے موجود۔ پھر ہر ایک کی شاخیں پھر ان شاخوں کی شاخیں۔ عزت و شرافت کا معیار شخصی نہیں بلکہ نسلی و موروثی قرار پا گیا۔ جو اونچا ہے وہ اس لئے کہ اس کے باپ دادا اونچے تھے جو نیچا ہے وہ اس لئے کہ اس کے باپ دادا نیچے تھے اور خیر ایک ذات تو دوسری ذات سے شادی بیاہ کیا کرتی، ایک ہی ذات کی ایک شاخ بھی دوسری شاخ سے پیوند نہیں لگا سکتی، ایک ہی پلیٹ میں ساتھ کھانا کھانا ایک دوسرے کے آگے کا بچا ہوا کھانا کھانا الگ رہا، ایک دوسرے کے ہاتھ کا چھوا ہوا کھانا نہیں کھا سکتے۔ ایک دوسرے کے ہاتھ کا پانی نہیں پی سکتے۔ نیچ ذاتوں میں بھی ایسی نیچی کہ ان کا جسم اگر اونچی ذات والے کے جسم سے چھو جائے، اس کا سایہ اگر ان پر پڑ جائے تو یہ ناپاک ہو جائیں! انسان نے انسان کو کتے سے بدتر سمجھ لیا اور لگے ایک دوسرے سے بچنے، بدکنے، بھڑکنے، جرم یہ نہیں کہ حرکتیں فلاں اور فلاں کیوں کیں۔ بلکہ صرف یہ پیدائش فلاں اور فلاں ناشدنی خاندان میں کیوں ہوئی!

وہم پرستیوں کی گرم بازاری ہو گئی۔ ضعیف الاعتقادیوں کی بن آئی۔ ہر ندی ہر پہاڑی، ایک دیوی، ہر پہاڑ، ہر دریا ایک دیوتا، گائے، بیل، سانپ، کچھوا، چوہا اور کیڑے خدا کے اوتار، پیپل، برگد، تلسی کے پتوں پتیوں میں الوہیت کے آثار! کیا کیا پرستی

کے اثر سے جوتش اور نجوم کا زور۔ فلاں دن نحس، فلاں تاریخ منحوس۔ چلتے وقت چھینک آگئی تو قدم آگے نہ اٹھائیے، سڑک پر کالی بلی راستہ کاٹ گئی، تو بجائے سفر کے گھر واپس آجائیے۔ زندگی میں سانس لینا دشوار، قدم قدم پر وہم پرستیوں کا پہرہ، گھر گھر میں بھوت پریت کا دور دورہ۔ آج سیتلا مائی کی جے منائیے، کل کالی دیوی کی بھینٹ چڑھائیے، بیجائی ہر رسم میں گھسی ہوئی گندگی ہر رواج میں گھر کئے ہوئے، بہار کا موسم آئے تو ہولی منائیے، شراب پی پی کر فحش راگ گائیے، برسات کے ختم پر جاڑے شروع ہوں، تو دیوالی کے چراغ جلائیے، لکشمی جی کی پیشوائی کے لئے جوئے کے پانسے پھینکیے، اور مندروں کی دیوداسیوں کی شرمناک شرح و تفصیل کوئی اس بھرے مجمع میں کرے تو کیسے کرے؟ غرض شراب خواری، فحاشی، حرام کاری، قمار بازی جائز ہی نہیں بعض موقعوں پر اور بعض موسموں میں جزو عبادت! عقائد کا اثر محض معاد و آخرت کے مسائل تک کب محدود رہا ہے؟ مجلسی، معاشری، خانگی، منزلی، غرض زندگی کے چھوٹے بڑے ہر شعبہ کے ادنیٰ ادنیٰ جزئیات تک انہیں گمراہیوں کے رنگ میں رنگے ہوئے!

ہندوستان سے کچھ ہی فاصلہ پر ایران ہے، اور شاید ایک ہی آریہ نسل سے دونوں قوموں کی آبادیاں ہیں، بہرحال متاثر ہندوستان سے یہ بھی بہت کچھ رہا۔ نام کے لئے اس کا مذہب اور تمدن ہندوستان سے الگ، لیکن حقیقت دونوں میں بہت کچھ مشترک۔ گویا تخم ایک، درخت دو۔ بت پرستی تو بے شک یہاں کم آئی لیکن کواکب پرستی، عناصر پرستی، شمس پرستی کچھ زیادہ ہی نمایاں۔ پہلا دھوکا تو اسی توحید کے بارے میں کھایا، جو ہر غیر الٰہی مذہب کی سمجھ سے باہر رہی ہے۔ یعنی خدا بجائے ایک کے دو فرض کئے۔ نیکی کے خدا، بڑے خدا کا مظہر نور یا روشنی کو مانا۔ اور پھر دنیا میں اسکا مظہر آگ کو قرار دیا۔ اس سے آتش پرستی مستقل طور پر لازم آگئی۔ اسی طرح بدی کے خدا،

چھوٹے خدا کا مظہر تاریکی کو ٹھہرایا۔ اور ہر اُس چیز کو جو اندھیرے سے تعلق رکھنے والی ہو منحوس قرار دیا۔ اعمال و معاملات میں کبر و نخوت عجمی تمدن کا نمایاں عنصر۔ اونچے مرتبہ والوں کے لئے خواجگی و آقائی اور نیچے طبقہ والوں کی قسمت میں خدمتگزاری و غلامی۔ زرتشت نے (اور عجب نہیں کہ وہ پیمبر ہوں) اپنی والی بہت کچھ اصلاح کرنی چاہی۔ پر تہذیب جاہلی کی سرشت ہی میں جو بے عنوانیاں پڑی ہوئی تھیں، وہ پوری طرح کیوں کر مٹ سکیں۔ دولت پرستی کے اس دور کا ردّعمل آخر دولت دشمنی کی شکل میں ظاہر ہوا اور اسی کا خوبصورت نام آج ڈیڑھ ہزار سال کے بعد کمیونزم گڑھا گیا ہے۔ مزدک نامی ایک شخص اٹھا اور اس نے سوشلزم اور اس کی انتہائی صورتوں کی تبلیغ شروع کردی شخصی ملکیت کوئی چیز نہیں۔ زمین مشترک، زر مشترک، یہاں تک کہ زن مشترک!

اب ایران و طبقات ایران سے چل کر پھر سرزمین ابنیا، شام و فلسطین میں آجائیے سنہ عیسوی ابھی شروع نہیں ہوا ہے اور سنہ ہجری کے شروع ہونے کو تو ابھی کوئی چھ سو سال باقی ہیں کہ قوم اسرائیل میں ایک ہی خاندان میں پہلے صالح ابن صالح یعنی یحیٰی بن زکریا پیدا ہوتے ہیں، اور پھر عیسٰی ابن مریم۔ دونوں کی تعلیم تمامتر قناعت، زہد، ایثار و توکل علی اللہ کی ہے۔ بگڑی ہوئی اور مسخ شدہ ذہنیت اس سادہ تعلیم کے قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ خود اپنی ہی قوم استقبال کرتی ہے اس دعوت کا بغاوت سے، اور داعیوں کا عداوت سے۔ پہلے حضرت زکریاؑ ختم کئے جاتے ہیں۔ پھر حضرت یحیٰیؑ کا سر ایک رقاصہ کی فرمائش کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ آخر میں نوبت حضرت عیسٰیؑ کی آتی ہے۔ حکومت اعلیٰ رومیوں کی، ان کا مذہب اور تمدن مشرکانہ۔ انہیں کی ماتحتی میں فلسطین ایک نیم آزاد صوبہ تھا۔ رسم و رواج کے قتیل، ظاہر پرستی کے شہید، کبر و نخوت میں مبتلا یہود ایک مقدمہ اس پیغمبر صدیق کے خلاف، حکومت سے بغاوت و غدّاری کا گڑھ کر لاتے ہیں، اور عدالت سے فیصلہ اپنے موافق حاصل کر کے اپنے نزدیک آپ کو سولی پر چڑھا ہی دیتے۔

ہیں۔ اِدھر یہ ہوتا ہے، اُدھر آپ کے عالی معتقدوں کو ایک اور یہودی پال، یا پولوس نامی، یہ پٹی پڑھاتا ہے کہ عیسٰی مسیح رسول اللہ نہیں، ابن اللہ تھے، نعوذ باللہ خدا کے بیٹے تھے، بلکہ خود شریک الوہیت تھے۔ اور الوہیت میں شریک تو ایک تیسری ہستی روح القدس بھی ہے۔ ظالموں نے اس طرح پیمبر کی لائی ہوئی توحید کو اپنی گڑھی ہوئی تثلیث سے بدل دیا۔ اور مسیحی تمدن، تہذیب، قانون، معاشرت سب پر رنگ شرک و جاہلیت کا چڑھا دیا ——— میری عمر کا ایک دَور اس منزل پر آکر تمام ہو جاتا ہے، اور اب آغاز دُوسرے دَور کا ہوتا ہے۔

زمین اسی طرح چکر کاٹ رہی تھی رات اور دن اپنے دورے اسی طرح پورے کر رہے تھے کہ سرزمین عرب کے مطلع سے طلوع ایک نئے آفتاب کا ہوا آفتاب جاہ و جلال کے لحاظ سے، ماہتاب حسن و جمال کے لحاظ سے۔ اُس نے مجھے آغوشِ شفقت میں لیا اور میں اس کے سایۂ عاطفت میں پلا اور بڑھا اب تک گویا میرا لڑکپن تھا، اب جوان ہوا، اور اس عہد میں میرا شباب اپنی پوری قوت اور پوری آب و تاب کے ساتھ چمکا۔ اس میں شک نہیں کہ شروع کے تیرہ سال میرے اوپر جو کچھ گزری، وہ جور و تعدی کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ جاہلیت نے جی توڑ کر مقابلہ قدم قدم پر کیا، جنگ گھٹنے ٹیک ٹیک کر چپہ چپہ پر کی۔ لیکن ۱۱ ۶۲۲ء میں مکّہ سے مدینہ ہجرت محمدی، تاریخ عالم کا وہ بے نظیر واقعہ ہے جس نے انسانیت کا رُخ ہی پلٹ دیا۔ دس سال کے اندر ہی اندر میں نے دنیا کو ایک نئے نظام سے روشناس اور مانوس کر دیا۔ محض لفظاً اور قولاً نہیں۔ عملاً اس کا نفاذ کر دیا۔ اُسے چلا کے دکھا دیا۔ (New order) کا چرچا آج آپ ہر طرف سن رہے ہیں، حقیقۃً (New Order) یا نظامِ نو، تو میرا نظام تھا جمود کے خلاف ایک مستقل چیلنج (اعلانِ جنگ) دنیا کے سارے نظامات کے مقابلہ

ہیں ایک مستمر نعرۂ انقلاب۔ ساری کہانی کے لئے فرصت اس مختصر نشست میں نہ آپ کو سننے کی، نہ مجھکو سنانے کی، لیکن قصہ مختصر، کچھ تو بہرحال سن ہی لیجئے۔

میری زندگی کی روح کہئیے یا جو ہر سب کو معلوم ہے عقیدۂ توحید ہے۔ اس بنیادی، مرکزی عقیدہ کا پہلا عملی اثر یہ ظاہر ہوا کہ نیم الوہیت یا فوق البشری تقدس کا خیال کسی مخلوق کسی برتر سے برتر انسان کے لئے باقی نہیں رہنے پایا۔ عبادتیں میرے ہاں سب کے لئے بالکل یکساں، استثناء اس قانون میں پیر، شہید، ولی، نبی، کسی کے لئے نہیں۔ نماز فرض پانچ وقت کی عوام کے لئے بھی، خواص کے لئے بھی۔ روزے فرض مہینہ بھر کے اُن کے لئے بھی، اِن کے لئے بھی۔ نماز جماعت میں جس کو جہاں جگہ مل جائے بس وہی اُس کا مقام۔ یہ نہیں کہ عوام پچھلی صف میں رہیں اور اکابر امت کے لئے جگہ اگلی صف میں نکالی جائے! اولیاء امت کو دوسروں کی عبادتوں میں، طاعتوں میں، تخفیف کرنے کا حق الگ رہا، اپنے ہی لئے کسی کمی بیشی، کتر بونت کا ذرا حق نہیں رکھتے کسی حلال کو حرام وہ نہیں کرسکتے کسی حرام کو حلال وہ نہیں بنا سکتے۔ سلام کے طریقے میرے ہاں ساری امت کے لئے ایک۔ بس وہی السلام علیکم (اللہ کی طرف سے سلامتی ہو تمہارے اوپر) یہی سلام بڑوں کے لئے، یہی چھوٹوں کے لئے، یہی برابر والوں کے لئے، یہی عامیوں کے لئے، یہی عالموں کے لئے۔ یہ نہیں کہ اونچی ذات والوں کے آگے ڈنڈوت کی جائے، اُن کے پیر پڑا جائے۔ یا بڑے مرتبہ والوں کے آگے ماتھا ٹیکا جائے، زمین بوس ہوا جائے یا ان کے لئے الفاظ بھی "آداب" اور "تسلیمات" اور "کورنشات" اور "بندگی" قسم کے ہوں!

مرد عورت کے درمیان حجاب کا قاعدہ میرے مخصوصات میں سے ہے۔ عورت پر واجب ہے بچنا بلا ضرورت ہر نامحرم کے سامنے آنے سے۔ اور اس نامحرم کے اطلاق میں امتیاز فاسق و متقی کا نہیں رکھا ہے۔ یہ نہیں کہ پردہ عوام سے تو کیا جائے، لیکن کسی

تقدس مآب شیخ وقت کا سامنا ہو، تو یہ قید اڑا دی جائے۔ اسی طرح معاملات ہوں جیسے وصیت یا نکاح، یا عبادات ہوں جیسے رویت ہلال، یا جرائم ہوں جیسے چوری غرض جہاں کہیں بھی شہادت کا معیار کوئی عدد رکھا گیا ہے، خواہ دو کا یا چار کا وہاں یہ گنجائش کہیں بھی میرے ہاں نہیں کہ عوام اُمت ہوں تو تعداد وہی دو یا چار کی رہے لیکن اگر کوئی اپنے وقت کے جنیدؒ یا اپنے زمانہ کے ابو حنیفہؒ ہوں تو گواہی صرف ایک ہی کی معتبر مان لی جائے ـــــ روحانیت کے اس تخیل سے میں ناآشنا ہوں، کہ عبادت میں، معاشرت میں، معاملت میں، قانون کی، ضابطہ کی، پابندیاں فلاں کیلئے ہوں، اور فلاں کیلئے نہوں حاضری عدالت سے مستثنیٰ ہوجانا آج ہر چھوٹے سے چھوٹا رئیس بھی اپنا حق سمجھتا ہے۔ میرے زمانہ میں خلیفۂ وقت بھی یہ آڑ ڈھونڈھ نہیں سکتے تھے!

مساوات اُمت کی تعلیم عبادات کے ذریعے، احکام فقہی کے واسطے میرے پروگرام کی خاص مد ہے۔ نماز ہو تو جماعت کے ساتھ! اور جماعت میں ایک صف میں کھڑے ہوں عالم و عامی، محمود و ایاز، سلطان و غلام، رئیس اور کنگال۔ بازو سے بازو ملا ہوا ہو، شانہ سے شانہ بھڑا ہوا ہو، عطر میں ڈوبے ہوئے رئیس کا اور پسینہ میں شرابور کاشتکار کا۔ حج کرنے امیر المومنین، خلیفۃ المسلمین جائیں تو، اور اُنکا ادنیٰ سے ادنیٰ غلام جائے تو، لباس دونوں کے جسم پر ایک ہو۔ وہی بے سلا ہوا کپڑا۔ ایک چادر کمر سے بندھی ہوئی۔ دوسری صرف ایک شانہ کو ڈھکے ہوئے اوپر کے جسم پر پڑی ہوئی۔ حاضری دیں عرفات میں، کنکریاں چنیں مزدلفہ میں۔ قربانی کریں منیٰ میں۔ چکر کاٹیں خانۂ کعبہ کے۔ سعی کریں درمیان دو پہاڑیوں کے سب ایک ہی وردی میں، خدائی فوج کے ایک ہی یونیفارم میں۔ پھر جب زندگی کے ختم پر مالک کے یہاں سے بلاوا پہونچے، تو وہی سادہ کفن کے تین کپڑے بادشاہ ہفت اقلیم کے لئے بھی، اور اس کی غریب سے غریب رعایا کے لیے بھی ـــــ میرے اس نظام

زندگی کے ماتحت باقی رہ سکتی ہے کسی گردن کش میں انانیت؟ زندہ رہ سکتا ہے کسی کا "پندارِ تفوق"؟

امارت و افلاس، دولت و فقر کے نفس امتیاز کو مٹا دینے کی غیر طبعی کوشش میں میں نے کبھی وقت ضائع نہیں کیا۔ مساوات مطلق، مالی و معاشی اعتبار سے نافذ کرنے کی خلاف فطرت کاوش میں کبھی قوت صرف نہیں کی۔ البتہ انتظام اسکا کر دیا۔ اور احتیاطیں ایسی رکھ دیں، کہ اس امتیاز سے پیدا ہونے والی تلخیاں زیادہ سے زیادہ گھٹکر رہیں۔ سانپ کی جان نہیں لی، لیکن اُس کے ڈسنے والے دانت نکال لئے۔ امیروں کو حکم دیا کہ اپنا بھائی سمجھیں امیروں کو بھی اور غریبوں کو بھی، امیروں کو اس لئے کہ باہمی چشمک، رشک، حسد و رقابت کے امکانات نہ رہیں غریبوں کو اسلئے کہ نخوت و خود بینی کے جراثیم فنا ہو کر رہیں۔ اور خود غریبوں میں اپنی حقارت و پستی کا، یا آج کل کی اصطلاح میں "احساس کمتری" کا نشو و نما نہ ہونے پائے۔ غریبوں کی امداد، اعانت، دستگیری کو امیروں کے رحم و کرم پر چھوڑا نہیں گیا، اُن کے اوپر واجب کر دیا گیا۔ اپنے فرض کو ادا کریں گے، تو خود اجر و انعام پائیں گے۔ غریبوں پر احسان اس سے ذرا بھی نہ کریں گے، احسان خود اپنی ذات پر کریں گے۔ غفلت برتیں گے تو مجرم ہو کر بیٹھیں ہوں گے۔ اپنی بھلائی اگر مقصود ہے تو لازم رکھیں گے اپنے نفس پر محتاجوں کی اعانت، مظلوموں کی نصرت، دادخواہوں کی فریاد رسی ـــــ صحیح، اصلی، سچی سوشلزم اس سے بڑھ کر اور کہاں ملے گی؟

کھانے پینے میں پرہیز، چھوت چھات، آپس میں تو کجا، میرے ہاں تو اُن سے بھی نہیں، جو مجھ سے باغی ہیں۔ میرے ہاں بڑے سے بڑا شخص جھوٹا کھا سکتا ہے، پی سکتا ہے۔ یہ نہیں کہ اونچی ذات والا نیچ ذات والے کے ساتھ بیٹھ کر نہ کھائے اُس کے ہاتھ کا نہ کھائے۔ ایک دوسرے کے برتن میں نہ کھائے۔ نہ یہ کہ جو لارڈ ہو وہ کامنر (Commoner) اس کے ساتھ میز پر کھانا نہ کھا سکے"۔ اسی فوج کا

پیادہ اپنے کرنل کے میس (Mess) کی طرف قدم بڑھانے کی جرأت نہ کرسکے! میرے ہاں تو منکروں سے، ہاں توحید و رسالت کے منکروں سے، آفتاب پرستوں سے، کواکب پرستوں سے، عناصر پرستوں سے، پتھر کی مورتیاں پوجنے والوں سے، کسی سے بھی کھانے پینے کا پرہیز نہیں۔ سب کے آگے کا جھوٹا جائز ——— ہے دنیا کی مذہبی تہذیبوں میں اس وسیع رواداری کی کوئی مثال؟ وحدت انسانی پر عمل میں اس حد تک زور دینے کی کوئی نظیر؟

شادی بیاہ میں میرے ہاں صرف کفو دیکھا جاتا ہے، یعنی جوڑ۔ کہ فریقین اگر معاشی و معاشری حیثیت سے ہم سطح ہوں گے تو آئندہ نباہ کی زیادہ توقع رہے گی۔ باقی ذات کی اونچ نیچ کا اینچ پینچ میں کیا جانوں؟ ذات پات کا وجود ہی میرے قلمرو میں نہیں۔ پیشے اپنے اختیاری بیشک ہو سکتے ہیں، لیکن آبا و اجداد کے پیشہ کی بنا پر ذات کا چل پڑنا میرے لغت میں بالکل بے معنی ہے۔ کوئی شخص اپنے ارادہ اور اختیار سے نائی کا پیشہ کئے ہوئے ہے، کوئی دھوبی کا، کوئی جلاہے کا، کوئی دُھنیے کا، کوئی رنگریز کا، کوئی بنئے کا، یہاں تک بالکل ٹھیک ہے لیکن فلاں شخص ذات کا جلاہا ہے، ذات کا نائی ہے، ذات کا دھوبی ہے، یعنی کسب کی بنا پر نہیں، نسب کی بنا پر خواہ مخواہ اس طبقہ میں داخل ہے، میں اس تخیل سے ناآشنا ہوں۔ ہانک پکار کر کہنا یہ تاکہ قطعاً ناآشنا نہ ہو یہ ضلالت تمامتر دَورِ جاہلیت کی یادگار ہے اور کمبخت کسی حد تک میرے اندر گھس آئی ہے۔ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، اور قلق بھی کہ آج مسلمانوں کی بعض "ذاتیں" فریاد برپا کر رہی ہیں ہمیں نیچ سمجھ لیا گیا ہے، اور سید، شیخ وغیرہ شریف ذاتیں ہمیں حقیر خیال کر رہی ہیں"۔ کوئی ان سادہ طبع لوگوں کو یہ جواب نہیں دیتا کہ بندہ پرور یہ شکایت تو آپ ہی کی اپنے ہاتھوں پیدا کی ہوئی ہے۔ آپ سے کہا یہ کس مردود نے کہ آپ اپنے کو ان نیچ ذاتوں میں شمار کرائیے؟ اونچ نیچ، شریف و رذیل کا سوال بعد کا ہے، گذارش یہ ہے کہ نفس

تقسیم ہی ذات رات ہیں میرے ہاں کب جائز ہے؟ آپ کہئیے کھُلے خوا نہ کہئیے، کہ ہم فلاں پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ٹھیک اور بالکل ٹھیک۔ لیکن جس دن آپ نے کہا کہ ہم فلاں "ذات" کے لوگ ہیں، آپ نے خود ہی الزام اپنے اوپر اوڑھ لیا، اپنے منہ سے اقراری مجرم بن گئے، اور میرے دامن کی پناہ سے نکل گئے۔ ع

نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو؟

ذات کے قایل تو غیروں کی دیکھا دیکھی آپ خود ہی ہو گئے اور پھر خود ہی نالاں ہیں کہ ہمارے اندر یہ ویش کیسے، یہ "شودر" کیسے یہ اچھوت کیسے؟ ——— میں کیا جانوں کیسے

شخصی اور خانگی زندگی کے تمام ترین اور اہم ترین واقعات شادی اور موت ہیں، دونوں کا ایک سرسری منظر ذرا میرے زیر اثر گھرانوں میں دیکھتے چلیئے۔ مسلمان لڑکی ادھر سیانی ہوئی، اُدھر فکر ماں باپ کو شادی کی شروع ہوئی۔ نسبت کے پیام آنے لگے۔ فکر اس کی نہیں کہ زائچہ ملایا جائے، کنڈلی ملائی جائے، منحوس گھڑی ساعت سے بچا جائے۔ گھڑی کے انتظار میں عمریں گزر جائیں، نجومی، جوتشی، رمّال کا دخل کسی موقع پر نہیں۔ نہ یہ بے فکری کہ جلدی کیا ہے لڑکی جوان ہو کر اپنا شوہر خود ہی ڈھونڈھ لے گی۔ عمر بھر کے شریک زندگی کا انتخاب، زندگی کا دقیق ترین، دشوار ترین، اہم ترین، نازک ترین انتخاب ہے یہ ضرورت اس میں جوش کی نہیں، ہوش کی، جذبات اور دیوانگی کی نہیں، عقل و فرزانگی کی، اچھے اچھے تجربہ کاروں کی، پختہ دماغوں کی عقلیں چکر کھا جاتی ہیں۔ عقل و تجربہ سے خالی، اور جذبات سے بھری نوجوان لڑکی یا نوجوان لڑکے کے سر اس کا بار تمام تر ڈال دینا، اور خود دور سے محض تماشہ دیکھنا، اولاد کے ساتھ ہمدردی نہیں بیدردی ہے، دوستی نہیں دشمنی ہے گویا ایک پندرہ سال کی لڑکی یا لڑکے سے توقع یہ ہے کہ اسے ضروریات وجذبات کا اندازہ ہے ۲۵ برس کے بھی سن کا، اور ۳۵ برس کے بھی سن کا، اور ۴۵ برس کے بھی سن کا، اور ۵۵ برس کے بھی سن کا! زندگی کے جو اُتار چڑھاؤ، فطرت بشری کی

جو نیرنگیاں، نوجوانوں کے لئے ابھی پردۂ راز میں ہیں، بڑے بوڑھوں کے لئے آپ بیتی بن چکتی ہیں۔ البتہ صلاح و مشورہ کی حد تک ان نوجوانوں کو بھی شریک رکھنا ضروری ہے کہ بہر حال رائے تو کسی درجہ میں وہ بھی رکھتے ہیں۔ غرض بڑوں نے (یا فقہا کی اصطلاح میں اولیانے) اپنے طور پر خوب جانچ پرتال کر کے۔ چھوٹوں کی رائے و مرضی دیکھ کر، بات ٹھہرائی۔ جہیز کا سامان ہیا کیا گیا حسب حیثیت۔ یہ نہیں کہ جہیز کے لئے قرضہ اتنا لیا جائے کہ آخر میں نوبت خودکشی کی آجائے۔ کورٹ شپ کا قدم کسی منزل میں درمیان میں آنے نہ پایا۔ اور مسلمان عروس اور اس کا شوہر دونوں اُن بیحیائیوں سے بچ گئے، جن سے آج اس روئے زمین پر بے شمار گھرانے جہنم کا نمونہ بن کر رہ گئے ہیں۔ خیر یہ مرحلے طے ہو لئے، تو ایک تاریخ سعید نکاح کی قرار پائی۔ دلہن کے گھر پر دولہا والے اور خود دلہن والے جمع ہوئے۔ شوہر سے اس کی حسب حیثیت ایک رقم مہر کا اقرار کرایا گیا ——— ایک زندہ ہستی اپنے کو دوسری زندہ ہستی کے سپرد کر رہی ہے، آخر اس کا کچھ تو نذرانہ چاہیئے۔ اسی نذرانہ کا نام مہر[۱] ہے ——— اب ضابطہ و قانون کے مطابق اقرار پہلے لڑکی سے کرایا گیا، اور پھر لڑکے سے۔ چپ چپاتے نہیں، علانیہ۔ لڑکی سے عورتوں کے مجمع میں، لڑکے سے مردوں کے جلسہ میں۔ اور قبل اس کے کہ شوہر اپنی زبان سے اتنی بڑی ذمہ داری کا اقرار کرے، اس کے سامنے خطبہ پڑھا گیا میری سرکاری زبان عربی میں۔ اس خطبہ میں نہ شاعری ہوتی ہے نہ خیال آرائی۔ اس میں بیان ہوتی ہیں نکاح کی فضیلتیں اور برکتیں، زوج و زوجہ کے باہمی حقوق کی اہمیت اور خوفِ خدا کی تاکید۔ اس کے بعد حسب حیثیت عزیزوں اور دوستوں کی دعوت۔

---

[۱]:۔ صاحب ہدایہ کے الفاظ ہیں:۔ المہر واجب شرعاً ابانۃً بشرف المحل (مہر ایک حق شرعی ہے اعزاز محل یعنی زوجہ کے لئے) نذرانہ کا لفظ اسی اعزاز کے مفہوم کو ادا کر رہا ہے۔

بس لیجئے ہو گیا نکاح مسلمان مرد کا مسلمان عورت کے ساتھ۔ خدا کا واسطہ درمیان میں لاکر دو خدا پرستوں کی زندگیاں ایک کرادی گئیں۔ اور بارک اللہ کی آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں۔ شروع سے آخر تک نہ مشرکانہ اور وہم پرستانہ رسوم کی ٹیم ٹام۔ نہ باجے گاجے ناچ رنگ، آتشبازی کی دھوم دھام۔ نہ غیروں کے ہاں کی طرح میرے ہاں یہ قید کہ نکاح وہی پڑھائے جو خاندان کا لگا بندھا ہوا پنڈت پروہت ہو یا باضابطہ پادری ہو۔ نہ میرے ہاں یہ پابندی کہ نکاح صرف گرجا کے ہال کی طرح مسجد ہی کے دالان میں ہو سکے۔ ہر جگہ ہو سکتا ہے۔ ہر شخص پڑھا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ شوہر خود ہی اپنا نکاح گواہوں کے سامنے پڑھ سکتا ہے! میرے ہاں تو انگریزی الفاظ میں (Every man is his own priest) کی تصدیق قدم قدم پر موجود۔ اور یہی وجہ ہے کہ جو تو میں مجھ سے متاثر اور میرے زیرِ نگیں ہیں ان میں کسی کی زبان میں priest اور Priesthood کا صحیح ترجمہ بھی موجود نہیں!

اب موت کے منظر کی طرف آئیے۔ بیمار بستر مرگ پر پڑا ہے۔ تیمار دار اُس کے پاس سے ہٹنگے نہیں۔ طاعون ہو یا ہیضہ، اس سے ڈریں گے نہیں۔ عزیز تو عزیز ہی ہیں غیر تک اُس کی خدمت میں لگ جائیں گے، اور یہ کچھ اُس پر احسان سمجھ کر نہیں، اپنے لئے باعث سعادت سمجھیں گے۔ نزع کا عالم طاری ہے۔ عزیز و قریب ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ کوئی سورۂ یٰسین سنا رہا ہے، کوئی کلمۂ توحید بہ آواز بلند پڑھ رہا ہے، کوئی محض اللہ اللہ کر رہا ہے۔ کہ رخصت ہونے والے کے کان میں اس عالم ناسوت کی جو آخری آواز پڑے، وہ اللہ کا نام اور توحید کا کلمہ ہی ہو۔ مریض کی حالت اور گری۔ اب اُسے قبلہ رُخ کر دیا گیا۔ کہ جدھر روح کی توجہ ہے، اسی طرف جسم کا رُخ بھی ہو جائے، میسر ہوا تو منہ میں آب زمزم کے قطرے ٹپکا دیئے گئے، کہ اس دارِ فانی سے کوچ کرتے وقت آخری ناشتہ اسی پاک پانی کا ہو۔ سانس رُکی۔ اور اُدھر منہ پرا ور آنکھوں پہ چھینٹیں

لپیٹ دی گئیں کہ ظاہری شکل کے احترام میں بھی فرق نہ آنے پائے۔ اگر آنکھیں کھلی رہ گئیں، یا ہونٹ کھلے رہ گئے، تو ممکن ہے کسی دیکھنے والے پر بُرا اثر ڈالیں۔ یہ دھجیاں غسل کے وقت تک لپٹی رہیں گی۔ تاکید ہے کہ ہاتھ یا پیر یا کوئی عضو اکڑا نہ رہ جائے۔ بدمنظری کسی طرح کی نہ پیدا ہونے پائے۔

یہ ہو چکا تو اب اہتمام غسل کا شروع ہوا۔ پانی نیم گرم کہ تازہ نعش کے جسم کو ناگوار نہ ہو۔ کپڑے احتیاط سے اُتارے گئے۔ پہلے وضو کرایا گیا، پھر پورا غسل دیا گیا۔ حتی الامکان اعزا اقربا اس سعادت میں حصہ لیتے رہے۔ میری حکومت میں نہ تہابر مئی کی قسم کی کوئی ذات ہے، نہ (Undertaker) کے قسم کا کوئی پیشہ۔ گور و کفن کی ساری خدمتیں خود آپس ہی والے انجام دیں گے۔ غسل کے بعد اُجلا اُجلا بے سلا، نیا لباس زیب تن کیا گیا، کافور اور دوسری خوشبوؤں میں بسا ہوا۔ وضو میں جو اعضا دھلتے تھے، اور نماز میں جو اعضا فرش زمین سے لگتے تھے، انہیں خاص طور پر کافور سے منور کیا گیا۔ کہ کل جن اعضاء کو چمکنا ہے، اس کی کچھ جھلک تو آج ہی ظاہر ہو جائے۔ اب جنازہ سیج دھج سے روانہ ہوا، یہ نہیں ہوا کہ لاش گاڑی پر لاد دی جائے یا پیشہ ور مزدوروں سے یہ بار اٹھوایا جائے۔ اور خود موٹروں پر بیٹھ، سگرٹ اور سگار کا دھواں اُڑاتے ہوئے ساتھ چلا جائے، کہ گویا یہ بھی کوئی تفریحی تقریب ہے، عزیز، قریب، بڑے چھوٹے، یہ وہ سب پیدل ساتھ چل رہے ہیں، سر جھکائے ہوئے کاندھا دیتے ہوئے، زیر لب کلمہ پڑھتے ہوئے۔ گویا میت کوئی بڑی معزز و محترم ہستی ہے اور یہ سب اس کی سواری کے کہار ہیں۔ مسلمان کا مرتبہ مر کر گھٹا نہیں، کچھ بڑھ ہی گیا۔ میت محلہ کے بھشتی کی ہے، نائی کی ہے، موچی کی ہے اور جنازہ کو دیکھیے کہ شیخ صاحب بھی ہاتھ لگاتے جاتے ہیں اور سید صاحب بھی، ڈپٹی صاحب بھی اور جج صاحب بھی۔ نماز ہوئی اور سب نے مل کر پڑھی ــــــ وہ میری اجتماعیت آخر کہاں جائے ــــــ نماز میں

دعا ہوئی مغفرت کی اور سلامتی ایمان کی۔ تنہا اُسی میّت کے لئے نہیں، ساری امت کے لئے۔ زندوں کے لئے بھی اور مردوں کے لئے بھی (حیّنا و میّتنا) چھوٹوں کے لئے بھی اور بڑوں کے لئے بھی (صغیرنا و کبیرنا) جو حاضر ہیں اُن کے لئے بھی جو غائب ہیں اُن کے لئے بھی (شاہدنا و غائبنا) مردوں کے لئے بھی عورتوں کے لئے بھی (ذکرنا و انثینا) غرض یہ کہ سب کے لئے۔ اور وہ بھی غائب کے مجہول اور مضمحل صیغہ میں نہیں، جیتے جاگتے ہوشیار و بیدار جمع متکلم کے صیغہ میں۔ زمین دوز مکان سوندھی سوندھی کچّی مٹی کا پہلے سے تیّار ہے، کیوڑہ چھڑک کر اُسے معطّر کر دیا گیا۔ اور پھر زمزم کے اگر چند قطرے میسّر آ گئے جب تو خاکدانیوں کا رشتہ کہنا چاہیئے کہ اس لمحہ آسمانیوں سے جڑ گیا۔

آگ میں ڈالا نہیں گیا۔ کسی دیوی دیوتا کے نام کا منتر نہیں پڑھا گیا کسی بند میدان میں چھوڑ آیا نہیں گیا، کہ چیل اور کوّے اور گدھ نوچ نوچ کر کھالیں۔ مٹی کے پتلے کو اسی مٹی کے مکان میں ادب و احترام سے اتارا گیا، کہ عنصر، عنصر سے ہم آغوشی کی لذّت قیامت تک پاتا رہے۔ جسم کو اتارتے گئے، اور مکین و مکان دونوں کے خالق کا نام لیتے گئے، اور آخر آخر گواہی دیتے گئے کہ یہ سرکار کا باغی نہیں، وفاداروں میں، اطاعت کیشوں میں تھا۔ (بسم اللہ و باللہ و علیٰ ملۃ رسول اللہ) دروازہ بند کیا۔ اوپر سے مٹی ڈالتے گئے، اور خوشخبری کا سرکاری پروانہ سناتے گئے۔ منہا خلقناکم، اسی سے تو ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا، تمہارا گوشت پوست اسی سے تو بنایا تھا، یہ مٹی تو تمہارے لئے مانوس ہے، مرغوب ہے، محبوب ہے، اس سے وحشت کیسی؟ دہشت کیسی؟ وفیہا نعیدکم، اب اسی کی طرف تمہیں پھر لوٹا رہے ہیں۔ قطرے کو دریا سے ملا رہے ہیں۔ ومنہا نخرجکم تارۃً اُخریٰ۔ اور یہ نہ اندیشہ کرنا کہ وجود شخصی کی لذّت ہمیشہ کے لئے آج ختم ہو رہی ہے۔ ابھی تو وجود دائمی کی نعمت سے سرفرازی ملنے والی ہے، اور وہ اسی سے نکل کر ملے گی۔

شادی اور موت کے ساتھ ولادت کے منظر کو بھی یاد کرتے چلیئے۔ بچّہ نے اِدھر دنیا

میں قدم رکھا اُدھر جسمانی پاکی کے بعد اس عالم ناسوت کی سب سے پہلی صدا جو قصداً اہتمام کے ساتھ اس کے کان میں پہنچائی جاتی ہے، وہ کون سی ہوتی ہے؟ وہی اللہ کی بڑائی کی، اللہ کی توحید کی۔ رسول کی رسالت کی! وہی حرف کتاب زندگی کی بائے بسم اللہ بھی اور تائے تمّت بھی۔ اور وہی ایک نقش رفیق نظر رہے اس کتاب کے ہر باب میں، ہر فصل میں، ہر صفحہ میں، ہر سطر میں!

شادی، موت، ولادت کے موقع تو پھر بھی کبھی کبھی آنے والے ہیں، میری بستی میں تو بسنے والوں کے روزانہ زندگی کے ایک ایک جزئیہ کو لیجئے، ہر سمت جلوہ توحید کا، ہر آن نعرۂ تکبیر کا! آپ اپنے ہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ دوست عزیز ملنے آئے، آپ اُنکا مزاج پوچھتے ہیں وہ آپ کا۔ جواب دونوں کی زبان سے نکلتا ہے "الحمدللہ خیریت ہے" امتحان میں پاس ہوئے، مقدمہ جیتے، کہیں سے انعام ملا، بیماری سے شفا پائی، اولاد ہوئی، غرض خوشی کی کوئی بھی صورت بڑی یا چھوٹی ادھر پیدا ہوئی، اور اُدھر زبان پر آیا وہی "الحمدللہ"! اور تو اور آپ محفل میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ چھینک آئی، آپ بولے الحمدللہ، پاس ہی سے جواب ملا۔ یرحمک اللہ! کوئی بیٹھنے سے اٹھنے لگا، گرنے سے سنبھلا، باہر سے گھر میں قدم رکھا، گھر سے باہر کے لئے قدم نکالا، دسترخوان بچھایا، پانی کا گلاس منہ سے لگایا، جلسہ میں تقریر شروع کی، اور خدا جانے اسی قسم کے کتنے بے شمار موقعوں پر زبان نے کہا "بسم اللہ"! صبح سویرے آنکھ کھلی اور زبان نے پہلی دفعہ جو تلفظ کیا؟ وہ وہی لاالہ الا اللہ! کسی حادثہ کی خبر آئی، کوئی دنیا سے رخصت ہوگیا، کوئی قیمتی چیز غائب ہوگئی، دل کو صدمہ پہونچا، اور زبان نے ادا کیا "انا للہ"۔ کسی کا دل بڑھانا ہوا۔ ہمت دلانی ہوئی، اور آپ نے کہا "ماشاءاللہ"۔ کسی کا شکریہ ادا کرنا ہوا، اور آپ کی زبان پر آیا "جزاک اللہ"۔ کسی کو داد دینی ہوئی اور آپ بولے "سبحان اللہ"۔ اپنی کسی غلطی کا احساس ہوا، کسی سے معذرت کرنی ہوئی، اور آپ نے پکار کر کہا "استغفراللہ"

یا "لا حول ولا قوۃ الا باللہ"۔ شادی کی محفل میں اِدھر دولہا نے کہا "قبول کیا" اُدھر پاس سے نعرہ لگا "بارک اللہ"۔ اپنا یا کسی کا دل گرماتا ہوا تو زبان نے پکارا "اللہ اکبر!" دل میں جذبہ شدید پیدا ہوا حیرت کا یا عظمت کا، یا نفرت کا اور آپ بول اُٹھے "معاذ اللہ" "العظمۃ اللہ" "اللہ اللہ"! یا "الا اللہ"! کبھی کوئی گندہ قول نقل کرتا ہوا، تو زبان نے پیش بندی کی کہ "نعوذ باللہ"۔ کسی کو رخصت کرتا ہوا تو زبان پر آیا "خدا حافظ" "فی امان اللہ" کسی سے ملے، کسی سے رخصت ہوئے، کسی کو خط لکھنے بیٹھے تو زبان یا قلم پر آیا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ"۔ کسی سے مصافحہ کیا تو زبان نے کہا "یغفر اللہ لنا ولکم"۔ کسی موقع پر صفائی پیش کرنی ہوئی، کسی الزام سے تبرّی کرنی ہوئی، اور آپ پکار رہے "حاشا للہ"۔ کوئی وعدہ کرتا ہوا، کوئی ارادہ ظاہر کرتا ہوا، اور زبان سے بے ساختہ نکلا "ان شاء اللہ"۔ میت کو قبر میں اتارا، تو کہا "بسم اللہ وباللہ وعلی ملۃ رسول اللہ"۔ کسی کو اپنی بات پر زور کے ساتھ یقین دلانا ہوا تو کہا "واللہ ثم باللہ"!

میرے اور میرے والوں کے یہ عام معمولات کسی سے چھپے ہوئے ہیں؟ بڑے چھوٹے، دوست، دشمن، سب پر عیاں ہیں۔ خدا کا نام۔ اللہ کا ذکر میری روح کی غذا ہے، میری زندگی کا جزو ہے، میری گفتگو کا تکیہ کلام ہے۔ سوتے، جاگتے، اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے، اس کثرت سے ذکر الٰہی کی توفیق اور کسی قوم کو ہوئی ہے؟ خالق اور مخلوق دونوں کے حق ادا کرنے میں ایسی قوم کا قدم کسی سے پیچھے رہ سکتا ہے؟ حد یہ ہے کہ جو عقیدۃً مسلمان نہیں، صرف مسلمانوں کے پڑوسی رہے ہیں، جن کے دل مسلمان نہیں صرف زبانیں مسلمانوں کی زبان بولنے لگی ہیں، وہ تک اسی رنگ میں رنگ گئے ہیں، اسی ہوا میں رس بس گئے ہیں ـــــــ "سبحان اللہ" اور "ان شاء اللہ" کے کلمے کشمیری پنڈتوں کو بے ساختہ بولتے، اور کائستھوں کو بے تکلف لکھتے کس نے نہیں سنا ہے؟ کس نے نہیں دیکھا ہے؟

معاشرت کے ان منظروں کی سرسری سیر کے بعد اب میرے مالی اور معاشی نظام کی طرف آئیے۔ تجربہ کی بات کہی جس نے بھی کہی کہ دنیا میں جھگڑے فساد کی جڑ یہی تین چیزیں ہیں۔ زر، زمین، زن اور ان تینوں میں زر سب سے مقدم۔ دنیا کے کسی حصہ میں نکل جائیے، جنگ اور بلوے، مقدمہ بازیاں اور جعلسازیاں، خونریزیاں اور فوجداریاں، جو آئے دن ہوتی رہتی ہیں، ان کا جائزہ لے ڈالیے، سب کا نہ سہی اکثر کا سرچشمہ یہیں سے اُبلتا نظر آئے گا۔ دوسرے مذہب، دوسرے تمدن، دوسرے فلسفے ظاہر پرستیوں میں پڑ کر اوپری علامتوں کو اصل مرض سمجھ بیٹھے۔ کسی نے سنیاسں کا بھبھوت مَل، دھرم کی گنگا جلی اُٹھالی کہ روپیہ کا ہاتھ سے چھونا حرام، جو چھوئے اس کا جسم ناپاک ہو جائے! اور پولوس کی بھیڑوں کا گلہ تو اپنی کتاب مقدس میں یہ نوشتہ پا رہا ہے کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے نکل جانا آسان، اور دولتمند کا آسمانی بادشاہت میں داخلہ مشکل! اور کسی کے دل پر دولت کی عظمت کا اور اہمیت کا وہ سکہ بیٹھا کہ اس نے لکشمی دیوی کے نام سے دھن دولت کی مستقل پوجا شروع کر دی! ــــ شرک وجاہلیت کے مذہبوں میں افراط وتفریط کی یہ مثال کچھ انوکھی اور نادر نہیں۔

اب مجھے دیکھئے میں نے کس طرح مرض کی ظاہری علامتوں کو نہیں، بلکہ حذاقت کے ساتھ اصل اسباب مرض کی تشخیص کی۔ اور سانپ کے زہریلے دانت الگ کر کے کس بے فکری کے ساتھ سانپ کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا۔ میں نے اعلان کیا کہ حرام دولت نہیں، دولت کی ہوس ہے۔ کسبِ زر نہیں، جمع زر ہے، دولت کی محبت عین دنیا کی محبت ہے، اور جو دنیا کو برتنے کے بجائے اُس کے جال میں پھنس گیا، وہ میری برکتوں سے کورا رہ گیا۔ روپیہ کی مثال تو پانی کی سی ہے۔ بہتا رہے، چلتا رہے، رواں رہے، تو بڑے سے بڑے دریا، ساگر، سمندر بھی کام ہی کے ہیں۔ تفریح کے ذریعہ ہیں، صحت کے خزانہ ہیں، کبھی پانی اگر رکا، ایک جگہ اگر جم گیا، تو بس نالے اور تالاب بھی گندگی کے گھر ہیں، بیماری

اور تعفن کے اڈے ہیں۔ لیکن دنیا کو برتنا، دنیا کو صحیح طور پر استعمال میں لانا، فرائض میں داخل ہے۔ اس لئے روپیہ جائز طریقہ پر کمانا، بہ قدرِ ضرورت تحصیلِ زر کرنا، لازمۂ حیات ہے۔ روپیہ کماؤ۔ لیکن کھاؤ اور کھلاؤ، البتہ اس چشمہ پر بند نہ لگاؤ، اس دھارے کو بہتا ہوا رکھو۔ کسبِ معاش کے لئے ہاتھ پیر نہ ہلانا، راہب بن جانا، بھیک اور نذر کرنا اپنے کو بھکشو کہلانا، جس مذہب میں بھی عبادت ہو، قربِ الٰہی کا ذریعہ ہو، میرے ہاں ننگِ انسانیت ہے، توہینِ آدمیت ہے۔ کسبِ معاش پر میرے آقا و سردار نے زور دیا ہے، اور بھیک مانگنے سے شرم دلائی ہے۔ تجارت، زراعت، صنعت، حرفت، ملازمت، مزدوری کے صدہا دروازے میرے ہاں کھلے ہوئے۔ اِن میں سے ہر جائز پیشہ اختیار کر لینا میرے ہاں باعثِ فخر، موجبِ اجر۔

مشرکانہ اور ملحدانہ تہذیبوں میں جُوا بالکل جائز ہے۔ جائز ہی نہیں بعض صورتوں میں واجب۔ تہواروں کے دن بہ طورِ شگون جُوا کھیلنا جزوِ مذہب تھا، اور ہے۔ تفریح تو بغیر اس کے گویا ہو ہی نہیں سکتی۔ اور اب تو یاروں نے زندگی اور صحت پر بھی پانسے ڈالنے شروع کر دیئے ہیں، جان اور تندرستی کو جُوئے کے داؤں میں لے آئے ہیں۔ اور حسبِ معمول نام اسکا بھی ایک شاندار سا لائف انشورنس رکھ دیا۔ میں نے آکر پہلی بار جُوئے کے دستور پر ضربِ کاری لگائی۔ اور بتایا کہ اس کی ہر صورت حرام۔ نرد اور پانسہ کا ہر کھیل حرام۔ نقد و جنس کی بازی لگا کر تفریح اور تماشہ کی ہر قسم حرام۔ لاٹری ناجائز، گھوڑ دوڑ پر، فٹ بال پر بازی لگانا ممنوع۔ انشورنس کمپنیوں کی "پالیسیاں" کارنیوال میں لکی بیگ Lucky Bag اور اخبارات میں لفظی معمّے، میری چڑھ۔ ماؤنٹ کارلو کا مشہورِ عالم قمار خانہ آج تہذیبِ جاہلی کا سب سے بڑا زندہ کارنامہ ہے۔ فرنگستان کا سب سے بڑا جُوا گھر، جس کمپنی کے پاس اس جُوئے گھر کا ٹھیکہ ہے، اُس کی آمدنی کا حساب تو کون لگا سکے گا۔ موٹا اندازہ اس سے کیجئے کہ اس بے اندازہ آمدنی پر جو ٹیکس وہ دے رہی ہے، صرف اس ٹیکس

کی رقم ایک لاکھ پونڈ (۱۳ ½ لاکھ روپیہ) سالانہ کی ہے! اور ابھی ۱۹۴۷ء تک یہی ٹیکس ادا کرتی رہے گی ـــــ میری عملداری میں اس طرح کا ادارہ کسی کے خواب و خیال میں بھی آسکتا ہے؟ میرے ہاں کی کتابی تعلیمات کو چھوڑیئے، عملاً بھی میری تاریخ کے دور میں کوئی ماؤنٹ کارلو ملے گا؟ کسی راجہ نل کا وجود نظر آئے گا؟

جُوئے کے ساتھ، بلکہ اُس سے بھی کچھ بڑھ کر دوسری چیز جو جاہلی تہذیب کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے، وہ اُس کا شوق سود خواری ہے۔ میرے سوا ساری تہذیبوں نے سود لیا ہے، سود دیا ہے اور جاہلیت جدید نے تو سوسائٹی کے دشمن، سود خوار کو سوسائٹی میں اعلیٰ اعزاز کے مقام پر پہنچا دیا ہے۔ "بینکنگ" کا عظیم الشان نظام اس تہذیب کے بڑے چھوٹے کہنا چاہیئے کہ سب ہی اداروں کو دبوچے ہوئے ہے۔ اور بینکر ہونا، ساہوکار ہونا، بینک کا منیجر ہونا، بینکنگ کمپنی کا ڈائرکٹر ہونا، جاہ و منزلت کے ایک اعلیٰ منصب پر فائز ہونا ہے۔ یونان، روم، ہندوستان، سود کے نقصانات محسوس سب کر چکے تھے لیکن ہمّت کسی کی نہ ہوئی کہ اسے روکنے کا قدم اٹھائے۔ خود آج اگر سودی قرضوں کا قدم درمیان سے اُٹھ جائے یہ جنگ جہاں سوز جو سارے عالم کے خرمنِ امن کو جلاتی، پھونکتی راکھ بناتی چلی آرہی ہے، کئے دن، کئے گھنٹے جاری رہ سکتی ہے؟ جان کی ہلاکتیں، مال کی بربادیاں، دیکھ سب رہے ہیں، بھگت سب چکے ہیں، یہ ہمّت مجھی کو، ہاں صرف مجھی کو، ہوئی کہ حرام کر دیا میں نے سود کی ہر شکل کو۔ سود مفرد کو۔ سود مرکب کو، سود لینے کو، سود دینے کو، سود کی کتابت کو، اس کتابت پر شہادت کو۔ دنیا میں (New order) نظام نو صرف میں نے چلایا۔ حُرمت کا فتویٰ صرف کتابوں تک محدود نہیں رہا۔ عملاً روحوں میں قوت اس سے پیدا کر دی۔ دلوں میں حقارت اس کی بٹھا دی۔ چھوڑیئے میری مقدس کتابوں کی تعلیمات کو، سوال کیجئے میری تاریخ سے۔ کوئی شائیلاک میری تاریخ کے بھی کسی دور میں پیدا ہوا ہے؟ میری عمر اتنی آئی، اور بے شمار انقلابات میں نے اپنے اندر دیکھ ڈالے۔ اچھے

برے، عادل ظالم، قانع طامع، سب ہی قسم کے حکمراں میرے نظام کے ماتحت پیدا ہوئے، پہ کسی دور میں نہ ہوا، بجز اسی بیسویں صدی کے، کہ مسلم بینک اور مسلم ساہوکارے کھلے ہوں۔ مسلم کو اپریٹو سوسائٹیز قائم ہوئی ہوں۔ مسلم انشورنس کمپنیاں وجود میں آئی ہوں۔ مسلم دہاتین ہونے پر فخر کیا گیا ہو۔ رائے عامّہ (پبلک اوپینین) میں نے ایسی تیار کردی کہ "بیاج" کے نام ہی سے، بوڑھے بچّے، عالم وعامی، سب کو بیزاری پیدا ہوگئی۔ مجھ میں جب تک قوت رہی مجال تھی کوئی اسم قسم کا خیال بھی لا سکتا۔ یہ تو اب جب مجھ پر ضعف غالب ہوگیا، اور آثار انحطاط کے، اضمحلال کے، ظاہر ہونے لگے، جب سے اس عفریت نے پھر سر نکالا اور اپنے چہرے پر طرح طرح کے رنگین اور دلکش نقاب ڈال ڈال کر کام لینا شروع کیا ہے! تو ایک طرف میں نے سخت سے سخت پہرے بٹھادیئے ناجائز طریقوں سے پیدا کی ہوئی دولت پر، اور بیٹھے بٹھائے محض بخت ونصیب کے زور سے اکبارگی پھٹ پڑنے والی ثروت پر، دوسری طرف وہ زور دیا اکل حلال پر کہ قوت بازو سے، صحیح طریقوں پر دولت کمانے کے ڈانڈے عبادت سے ملا دیئے۔ بیوی بچوں کی پرورش کا کنبہ قبیلہ کی خبرگیری کا مرتبہ اوراد ونوافل سے اونچا کردیا، تیسری طرف سرد بازاری کردی گداگری کی، نذر ونیاز کی۔ چوتھی طرف حق قائم کردیئے امیروں پر غریبوں کے، رئیسوں پر رعایا کے، زرداروں پر ناداروں کے۔ اور فرض کردی اعانت عزیزوں پر عزیزوں کی، پڑوسیوں پر پڑوسیوں کی، انسان پر انسانوں کی۔ زکوٰۃ جو نہ ادا کرے وہ گنہگار، صدقہ فطر، اور تحفۂ عید قرباں جو نہ پیش کرے وہ خطاکار۔ میرے ہاں دستور یہ نہیں کہ چندہ کا اعلان مقدم ہو، چندہ پر میرے ہاں تو قاعدہ یہ ہے کہ داہنا ہاتھ دے اور بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو! میرے فرزند راتوں کو چھپ چھپ کر حاجتمندوں کو نواز آتے تھے، کہ رات کے اندھیرے میں وہ اُنھیں پہچان بھی نہ سکیں۔ دنیا نے اتنی ترقی میرے زمانہ میں نہیں کی تھی کہ شام کو اعلان ہو چندہ کا اور صبح کو آنکھیں تلاش کررہی ہوں اخبار کے کالموں کی۔ سے شکریہ کا ریزولیوشن

ہے "حکّام والا مقام" کی خوشنودی کا پروانہ!

اور پھر میں قریب بھی نہیں گیا اس ظالمانہ فیصلے کے کہ جائداد منتقل ہوتی رہے باپ سے بڑی اولاد کی طرف اور باقی ساری اولاد گویا منہ دیکھتی رہ جائے۔ بلکہ انتظام یہ کیا کہ جائداد تقسیم ہو، اور تقسیم در تقسیم ہوتی رہے۔ بجائے سمٹے رہنے کے۔ بجائے ایک جگہ جمع رہنے کے، اس کے چھوٹے چھوٹے حصّے ہو جائیں اور وہ حصّے پھیلا دیئے جائیں زیادہ سے زیادہ حقداروں میں۔ اولاد اگر ہے تو حصّہ ساری اولاد پائے، بڑی بھی چھوٹی بھی، لڑکے اپنے لائق، لڑکیاں اپنے لائق۔ بیوی اگر ہے تو بیوی حصّہ پائے، اولاد اور بیوی کے بعد اور عزیز ہیں، ماں ہیں، باپ ہیں، بھائی ہیں، بہنیں ہیں، وقس علیٰ ہذا۔

غرض اس ہمہ جہتی انتظام سے میں نے مسئلہ دولت کو ایسا جکڑا کہ کوئی راہ ہی نہ رہی شیطان کی آمد و رفت کی۔ اور ایک ایسا عادلانہ، متوازن، معتدل نظام، مالی و معاشی اپنے ہاں قائم کر دیا کہ گنجائش ہی نہ رہی جذباتِ رشک وحسد کے اُبھرنے کی۔ اور کمیونزم، سوشلزم اور کسی ازم کے سوالات کے چھڑنے کی! اور وہی دولت جو حربہ سمجھ لی گئی تھی شر و فساد کا، بغض و عناد کا، میرے ہاں سکّہ بن گئی جنّت کی خریداری کا ذریعہ ہو گئی خالق و مخلوق کی خدمت گزاری کا۔

جمہوریت (ڈیماکریسی) اور آمریت (ڈکٹیٹرشپ) کے مناقشے اور عوامیت و خواصیت کے مناظرے میرے ہاں بیہودہ ہی نہیں، بے معنی بھی۔ میرے ہاں حکومت صرف ایک کی، لاغالب الا اللہ۔ قانون صرف ایک کا، "ان الحکم الا للہ" انسان، سلیم الفطرۃ انسان، دنیا میں صرف اس کا نائب۔ جامد اور ذی حیات سارے عنصروں پر اس کے قانون کو نافذ کرنے والا۔ قانون اساسی بنا بنایا موجود قرآن پاک کے صفحات میں۔ اس کی شرح و تفصیل محفوظ رسول پاک اور آپ کے صحابیوں کی حیات بابرکات میں۔ کوئی سوال

ایسا نہیں، نہ معاد، نہ معاش کا، اور کوئی مسئلہ ایسا نہیں، نہ شخصی نہ اجتماعی، جس کا حل میرے ہاں اصلاً نہ موجود ہو۔ کوئی مرض بڑا ہو یا چھوٹا ایسا نہیں جس کا نسخہ میری بیاض میں درج نہ ہو۔ تلاش و طلب شرط ہے ع

اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست!

میرے آقا و سردار کا طریقہ یہ تھا کہ سُنتے سب کی تھے، بولنے اور کہنے کا موقع بڑے اور چھوٹے سب کو دیتے تھے۔ عمل سب کچھ، اور سب کی سُننے کے بعد اس پر کرتے جو آپ کی رائے میں مناسب ہوتا۔ یہ تھا۔ صحیح احساس اپنی ذمہ داری کا، اور یہ تھی سچّی جمہوریت یا شوریت۔ یہی حال آپ کے بعد آپ کے سچّے جانشینوں کا، آزادی ہر شخص کو بولنے کی بلکہ ٹوکنے کی ہر وقت۔ میں اس طرز کی جمہوریت سے نا واقف، کہ رائے صرف اسمبلی اور کونسل کے ممبر دے سکیں، اور ممبر آبادی کے تناسب سے محدود ہوں فلاں تعداد میں، عمر کے حساب سے، امتحان کی ڈگری کے لحاظ سے، آمدنی کی میزان کے معیار سے۔ اور اس محدود و مخصوص طبقہ کے باہر قوم کا معزز سے معزز شخص بھی لاکھ چاہے، مگر زبان نہ کھول سکے۔ مقدس حلقے میں قدم نہ رکھنے پائے! میں آزادی رائے کے اس مفہوم سے بھی محروم کہ رائے پیش صرف اس وقت کی جا سکے جب پارلیمنٹ کا سیشن، کونسل کا اجلاس ہو رہا ہو، اور سال کے باقی سارے وقت زبانوں پر مہریں لگی رہیں! میرے ہاں قید نہ بوڑھے کی، نہ جوان کی، نہ امیر کی، نہ غریب کی، نہ پڑھے لکھے کی نہ ان پڑھ کی، نہ مرد کی نہ عورت کی، جو کلمہ گو چاہے، اور جب چاہے، دنیا کے سب سے بڑے ڈکٹیٹر (خلیفہ) کو ٹوک دے! میرے کانسٹیٹوشن میں لاکھوں، کروروں کی دولت لٹانے کی ضرورت نہ کسی پارلیمنٹ ہاؤس پر، نہ کسی کونسل چیمبر پر، نہ اُس کے عظیم الشان اسٹاف پر، نہ اس کے گرانبہا فرنیچر پر، بس مسجد اور صحن مسجد مع اپنے بوریوں کے، چٹائیوں کے، مصلوں کے شخصی

واجتماعی ہر ضرورت کے لئے کافی۔ اس کے در ہر وقت کھلے ہوئے۔ ضرورت نہ اردلیوں کی، نہ سنتریوں کی، نہ جمعداروں کی، پہرہ داروں کی فوج کی، نہ کسی ایک دربان تک کی!

اس طرز حکومت کو بھی ڈر کسی اندرونی کشمکش کا ہے؟ میرے ہاں بھی کوئی سوال پیدا ہوسکتا ہے افسری، ماتحتی کا، حاکمی و محکومی کا؟ چبھن پیدا کرنے والا جو اصل کانٹا ہوتا ہے، وہی میں نے راہ سے دور کردیا، نہ بڑے کو موقع افتخار کا چھوڑا اپنی بڑائی پر، نہ چھوٹے میں پیدا ہونے دیا احساس کمتری۔ خلیفہ اور نائب السلطنت سے لے کر ادنیٰ سے ادنیٰ پیادہ اور چوکیدار تک، سب کے سب عبادت الٰہی سمجھ کر، مشین کے پرزوں کی طرح اپنے اپنے فرض، اپنی اپنی ڈیوٹی میں لگے ہوئے ــــــ مشین کے پرزوں کو بھی کبھی کسی نے دیکھا ہے ایک دوسرے سے رشک وحسد کرتے ہوئے یا ایک دوسرے سے بھڑتے ہوئے، جھگڑتے ہوئے؟ بس یہی کیفیت راسخ کردی تھی میں نے اپنے ماننے والوں میں، اتار دی تھی اُن کے دلوں میں۔

چھوڑیئے خلافت راشدہ کے واقعات کو، کہ وہ بار بار کہے جاچکے ہیں، اور آپ میں سے اکثر کے کان میں پڑچکے ہوں گے۔ جانے دیجئے۔ عمر بن عبدالعزیز کو بھی۔ صدیوں بعد کے محمود غزنوی اور ملک شاہ سلجوقی کو لیجئے، کہ انکا شمار ٹھیٹھ دنیادار بادشاہوں میں ہے۔ غزنوی کے ہاں ایک معمولی رعایا فریاد لے کر پہنچتا ہے کہ "جہاں پناہ! رات کے وقت کوئی با اختیار عہدہ دار میرے ناموس پر ڈاکہ ڈالنے میرے گھر پھاندتا ہے"۔ بادشاہ یہ استغاثہ سن، اپنے اوپر کھانا پانی حرام کرلیتا ہے، رات کا منتظر رہتا ہے۔ جب رات ہولیتی ہے، بذات خود، اندھیرے میں تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے مظلوم کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ اور جب مجرم کو قتل کرلیتا ہے جب کہیں جاکر پانی پیتا ہے۔

ہے کوئی مثال اس کے قریب قریب بھی، بیسویں صدی کی بہتر سے بہتر جمہوریت میں
آمریت میں؟ سلجوقی ایک پُل سے گذرتا ہوتا ہے، کہ ایک غریب ضعیفہ راستہ
روک کر کھڑی ہو جاتی ہے اور کہتی ہے "اے بادشاہ! تیرے لشکریوں نے میری
بکری پکڑلی ہے۔ بتا کہ انصاف یہاں ہوگا یا پُل صراط پر"؟ مشرق کا جاہ و حشم والا
تاجدار جواب دیتا ہے کہ" وہاں نہیں، یہیں اسی پُل پر"۔ اور اس پر عمل کر کے دکھا
دیتا ہے۔ پھر وہی سوال کہ اس کی ہے کوئی نظیر آج بہتر سے بہتر آئین اور دستور رکھنے
والی حکومتوں میں؟ ——— دنیا لفظی بحثوں کے چکّر میں الجھی رہے، اصطلاحات اور
مزید اصطلاحات کے الجھاوے میں پڑی رہے، میں نے عمل سے دکھایا، کھُلی آنکھوں
سب کو مشاہدہ کرا دیا کہ بہترین نظام سیاسی اسے کہتے ہیں!

قانون میرے ہاں کا مبنی زیادہ سے زیادہ حق و عدل، زیادہ سے زیادہ اعتدال
و توازن پر۔ اوّل تو میری حکومت میں جو اخلاقی و معاشری ماحول، جو انفرادی و اجتماعی فضا
تیار ہوتی ہے، وہ خود ہی جرم کش و جرائم دشمن ہے۔ جرم کے لئے اس میں نشو و نما کا کوئی
موقع ہی نہیں۔ اور پھر ان حالات میں کوئی بدبخت اگر جرم کر ہی بیٹھے، تو میری عدالتوں
میں اس کا ثابت ہونا نہایت دشوار۔ اس لئے کہ سزا میرے ہاں شبہات پر نہیں دی جاتی،
اور محض قرینہ، قیاس، یا شہادتِ ضعیف بھی میرے ہاں کسی کو مجرم بنانے کے لئے کافی
نہیں۔ گواہیاں ہونی چاہئیں اور وہ بھی معتبر چشم دید۔ گواہی کا نصاب عموماً دو گواہوں کا
ہے۔ لیکن جہاں معاملہ آپڑتا ہے مسلم یا مسلمہ کی عزّت، حرمت، ناموس کا وہاں نصاب
اس کا بھی دوگنا کر دیا گیا ہے۔ کیوں کبھی ایسی زبردست گواہیاں ملنے لگیں، اور کیوں
کبھی کوئی مجرم سزا پانے لگا؟ اس لحاظ سے دیکھئے تو مجھ سے زیادہ نرم قانون شاید
دنیا کے پردے میں کہیں بھی موجود نہ ہو۔ لیکن دوسری طرف اتنی بردہ پوشیوں کے بعد،
صفت ستّاری کے اتنے مظاہروں کے بعد بھی، جب جرم ثابت ہو گیا، تو اب مجرم پر رحم و

کرم کے معنی ہیں جُرم نوازی و جُرم پروری کے۔ سزا کے نفاذ کے وقت میرا قانون سزا دے گا، سزا کے ساتھ تمسخر نہیں کرے گا۔ سزا ایسی ہو گی جو مجرم کو عمر بھر کے لئے سبق دیدے، مظلوم کے دل میں ایک حد تک ٹھنڈک پیدا کر دے، دیکھنے والوں کے دل عبرت سے تھرا دے۔ میرے یہاں یہ ہو نہیں سکتا کہ نام جیلخانہ کا لے کر سامان تفریح خانہ کے بہم پہنچا دئے جائیں۔ اور جن کا مقام فسق و فجور کا جہنم ہے، اُنھیں لا لا کر مخمل کے گدوں پر آراستہ کوچوں پر، پُر تکلف صوفوں پر بٹھایا جائے۔ جنگل کے شیر اور چیتے، ریچھ اور بھیڑیے اگر انسانی بستیوں میں آزادی سے گھومتے پھرنے کے لئے کھلے چھوڑے نہیں جا سکتے تو یقیناً ان اخلاقی درندوں کو بھی کٹہروں اور پنجڑوں میں بند کرنا ہو گا، شکنجوں میں کسنا ہو گا بلکہ ضرورت ہوئی تو انھیں فنا کے گھاٹ اتارنا ہو گا۔

جو شرابی اللہ کی لاکھوں نعمتوں کو چھوڑ، پانی کی، عرق کی بے شمار لطیف قسموں کو ٹھکرا کر شراب جیسی گندی اور طبعاً مکروہ چیز کو منہ لگاتا ہے، اور اس سے لذت لینے میں اپنے سارے جسم کو شریک کرتا ہے وہ شامت زدہ ہے اس قابل کہ اس کے جسم پر اتنے کوڑے برسائے جائیں کہ قانون الٰہی توڑنے کا نشہ اُس کا عمر بھر کے لئے ہرن ہو جائے۔ جو بدبخت جائز آمدنی کے سارے ذریعہ چھوڑ، اور ان کی ناقدری کر کے، اپنے بھائی کے گھر میں نقب لگا کر سوسائٹی سے امن اٹھا رہا، اور دوسروں کو ان کے رزق سے محروم کر رہا ہے، اُس کی سزا بھی یہی ہے کہ اُس کا دست آز سرے سے قطع کر دیا جائے، اور وہ ساری عمر ٹنڈا بنا ہوا اپنی بدبختی کا اشتہار دیتا پھرے۔ جو خبیث شادی کے ایک نہیں چار چار موقعوں اور اُن کے لئے ہر قسم کی سہولتوں، آسانیوں کے باوجود اپنی بہنوں، بیٹیوں کے ناموس کو غارت کر کے اپنا منہ کالا کرتا، اور معاشرہ میں اخلاقی اور جسمانی دونوں قسم کے امراض خبیثہ کا بیج بوتا ہے، وہ ناشدنی اس قابل ہی نہیں کہ زندہ چھوڑا جائے، اور اپنے وجود اپنی مثال سے شیطان کی ذریات کو خوش کرتا پھرے

یہ جو کچھ عرض ہوا کوئی فرضی افسانہ نہیں، کوئی تخئیلی مضمون آفرینی نہیں، ٹھوس واقعات اور سنجیدہ ثابت شدہ حقایق ہیں۔ اپنے عروج شباب کے زمانہ میں حکومت میں سنے لاکھوں میل مربع پر کئی میرے قلمرو میں ایک آدھ صوبہ نہیں، پورے پورے ملک داخل رہے ہیں، پوری پوری شہنشاہیاں۔ تاریخ کے شاہدعادل سے پوچھ دیکھئے، میرے دورِ دورہ میں ریکارڈ جرائم کا، گنہگاریوں کا، سیہ کاریوں کا کیا تھا؟ اور اب کیا ہے؟ ڈاکہ، چوری کے، نقب زنی کے، زہر خورانی کے اعداد اُس وقت کیا تھے اور اب کیا ہیں؟ سود خوری اُس وقت بھی گھروں کو اجاڑ رہی تھی؟ پورے پورے خاندانوں کا صفایا کر رہی تھی؟ ملکوں ملکوں آگ لگا رہی تھی؟ عصمت فروشی کی دوکانیں اس وقت بھی باضابطہ حکومتوں کی سرپرستی میں کھُلی ہوئی تھیں؟ بیحیائیاں اُس زمانہ میں بھی قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھی گئی تھیں؟ نشہ بازی کی سرکاری سرپرستی، فخر و اعلان کے ساتھ، اسوقت بھی محکمۂ آبکاری کے نام سے، محکمۂ افیون کے نام سے ہوتی تھی؟ قماربازیاں، شراب خواریاں، جعلسازیاں اُس وقت بھی آج کی طرح اپنے گندے اور گھناؤنے چہروں پر صدہا نقاب، خوشنما، خوشرنگ، ڈالے ہوئے اُبلی پڑتی تھیں؟ امراض خبیثہ کے لئے لاکھوں روپئے کے صرف سے اسپتال پر اسپتال کھُلنے کی ضرورت جب تھی یا اب پڑ رہی ہے؟ آنکھ کی، کان کی، دل کی، دماغ کی، معدہ کی، دانت کی، آنت کی بیماریوں کا شمار اُسوقت کیا تھا، اور اب کیا ہے؟ شراب کی، افیون کی، کوکین کی، ہیروئن کی، غرض ہر نشیلی چیز کی تجارت اور کاروبار زوروں پر اب ہے کہ اسوقت تھا؟ —— "کل" کو جانے دیجئے، آج بھی میں، زبون حال و شکستہ بال، جس حد تک جہاں کہیں بھی متصرف ہوں، شیطان کی گھاتیں کس حد تک چل پاتی ہیں؟ نجد میں، حجاز میں، یمن میں، سینا

بیشک نہیں ہیں، اسٹیج اوراسکرین کی دلفریبیوں کی جگہ بیشک سناٹا ہے۔ بڑے بڑے بینک، ساہوکارے بلاشبہ بہ منزلہ نہ ہونے کے ہیں ناچ گھروں، شراب خانوں کی تعمیر میں بیشک ایک اینٹ بھی نہیں لگی ہے! ورآرٹ گیلری کی تو بھنک بھی ابھی کانوں میں نہیں پڑنے پائی ہے، لیکن ساتھ ہی کیا حال ہے چوریوں کا، ڈکیتیوں کا، رہزنی کا خودکشی کا، اوراُن تمام خبائث کا، رذائل کا، غوایل کا جنھیں آپکا مشرقی ضمیر آج بھی لعنت ہی بھیج رہا ہے؟

میرا شباب عرصہ ہوا رخصت ہوچکا۔ میری قوت مدت ہوئی ضعف میں تبدیل ہوچکی طرح طرح کے امراض، عوارض کا خود شکار ہوں، ایرانی تمدن، ہندی تمدن، فرنگی تمدن کے اختلاط نے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ہے، بگاڑ ڈالنے میں میری صورت کے، میری سیرت کے، میری شخصیت کے۔ آئینہ دیکھوں تو خود اپنی شکل نہ پہچان سکوں۔ اس پر بھی اپنے تمام حریفوں پر بھاری ہوں، کیا اعتقادی اور خیالی معیار سے اور کیا عمل و تجربہ کے اعتبار سے۔ اور میرے فرزندو اور عزیزو! یہ تمامتر تمہارے اختیار میں ہے کہ ہمت کرکے مجھے جلاؤ اسلامی ہفتہ بجائے سال میں ایک بار منانے کے، سال کے ہر ہفتہ مناؤ، ہفتہ کے ہر دن، ہر گھنٹہ، ہر لمحہ مناؤ۔ یہ رچ جائے تمہارے جسم کے ریشہ ریشہ میں، بس جائے تمہاری رُوح کے گوشہ گوشہ میں، کام لو خودداری سے، غیرت سے، حمیت سے، صلابت سے، تو مجھ میں پھر آسکتی ہے وہی طاقت، وہی قوت، وہی حدت، وہی شدت، وہی رعنائی، وہی زیبائی اور دنیا کی آنکھوں کے سامنے دوبارہ منظر پھر سکتا ہے علی مرتضٰی کے فضل و کمال کا، عمر فاروق کی شوکت و اقبال کا، محمدی جاہ وجلال کا، احمدی حسن و جمال کا!

(منقول از صدق لکھنؤ مورخہ ۳۰ نومبر سنہ ۱۹۳۱ء)

کسی مسلمان طبیب کو نسخہ لکھتے آپ نے دیکھا ہے؟ ——— معالج کوئی اکیلے مسلمان تھوڑے ہی ہیں حکیم، ڈاکٹر، وید کے پیشے ہیں، ہر مذہب اور ملّت کے لوگ ہیں۔ سوال مسلمان طبیب کے نسخے کے باب میں ہے ——— ہاں تو مسلمان طبیب نسخہ لکھنے کو قلم اُٹھاتا ہے، تو شروع دوا سے نہیں کرتا، دعا سے کرتا ہے، قبل اس کے کہ نام ایک دوا کا بھی لکھے، نام دوا اور تاثیر دوا کے خالق کا لیتا ہے۔ اور سب سے پہلے نسخہ کی پیشانی پر، ہو الشافی لکھتا ہے! مریض کو سناتا ہے کہ شفا کہیں میرے ہاتھ میں نہ سمجھ لینا، وہ اختیار اور قدرت میں تو کسی اور ہی کے ہے، میں تو ایک بے بس اور بے جان واسطہ ہوں۔ اپنے نفس کو بتاتا ہے کہ تاثیر دواؤں میں نہیں، دواؤں کے خالق میں ہے۔ میں خود کیا چیز ہوں، جو کچھ بھی ہے میرا پروردگار ہی ہے۔ دنیا پر اعلان کرتا ہے کہ شفا کسی دیوی دیوتا کے بس میں نہیں۔ اِنکے اُنکے ہاتھ میں نہیں، صرف ایک مالک و مولیٰ قادر و مختار کے ہاتھ میں ہے!

طب کو طبِ "یونانی" کہتے ہیں، اور یونان معلوم ہے کہ دینداروں اور متقیوں کی نہیں، مشرکوں اور بت پرستوں کی بستی تھی۔ وہاں تو پوجا صحت و شفا کے دیوتا عسقلیبوس کی ہوتی تھی! اور منتیں اور نذریں اُسکی لڑکی ہائیجیار (Hygea) کے مندر پر چڑھائی جاتی تھیں۔ (انگریزی لفظ "ہائیجین" جو علم حفظان صحت کے معنی میں مستعمل ہے، اسی دیوی کے نام سے مشتق ہے)۔ وہاں کا طبیب اعظم بقراط تو توحید کے نام سے بھی شاید نا آشنا ہوگا، اور مشہور عالم ماہرِ فن جالینوس تو مشرک، کے مندر کا پجاری تھا۔ اس کافر کو مومن بنانا، اس مشرک سے کلمۂ توحید پڑھا دینا کام فرزندانِ اسلام کا تھا، اعجاز خود دینِ فطرت کا تھا! ——— جس چیز کو چھو دیا اُسے اپنا بنا لیا، جس راستہ سے گزر ہو گیا اُدھر سے خوشبو توحید کی آنے لگی، جس عمل میں ہاتھ لگا دیا، اُسے عبادت بنا دیا۔ نسخے ہندو اور عیسائی، یہودی اور پارسی

سکھ اور جین سب ہی لکھتے ہیں۔ اور اپنے نزدیک خلق خدا کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ مسلمان کے
قلم نے اس نسخہ نویسی کو بھی براہ راست خالق اکبر کی عبادت بنا دیا!

اشخاص میں، افراد میں انقلاب پیدا ہوتے سب ہی نے دیکھا ہے۔ جماعتوں، گروہوں
طبقوں تک کی کبھی کبھی کایا پلٹ ہو جاتی ہے لیکن علم و ادب کا نقطۂ نظر بدل دینا، فنون و صنائع کا
رُخ ہی سرے سے پلٹ دینا، ایک اشارہ سے سفلیات کو علویات کا رنگ دے دینا، فرشی کو عرشی
بنا دینا، یہ کارنامہ ہے بے مثال اور بے مثل ہماری تاریخ کا! ——— اکیلی طب پر موقوف نہیں،
فلسفہ اور منطق اور ہیئت اور خدا معلوم اور کیا کیا خاک بلا۔ ہم نے دوسروں ہی سے لیا، منکروں اور
مشرکوں، ملحدوں اور بے دینوں سے لیا، اور دم کے دم میں کیا سے کیا کر دیا!

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا!

جو گمراہیوں کے گڑھے تھے، وہی رشد و ہدایت کے مرکز بن گئے، جو راستہ کا خشک اور مُردہ پتھر
تھا، وہ ہیرے کی چمک دمک کے ساتھ جی اُٹھا! اور جو عنصری تھا، اُسے زیادہ سے زیادہ ملکوتی بنا دیا
تھا ——— ایک دور وہ تھا، اور ایک دور یہ ہے، کہ تہذیب جاہلی کی تجدید کے ساتھ انسانیت کا
ہر عنصر درندگی میں تبدیل ہو گیا۔ اور مطمح نظر بجائے ملکوتیت کے بہیمیت قرار پا گیا۔ وہی چوپایوں کی
طرح علوم عالیہ عقلیہ و روحانیہ سے غفلت، وہی درندوں کی طرح کھانے پینے، لڑنے بھڑنے، ایک
دوسرے کو نوچ لینے، پھاڑ کھانے میں انہماک، وہی جانوروں کی طرح حیوانی خواہشوں کی تکمیل
کے بعد سو رہنے پڑ رہنے کی عادت، وہی چرندوں اور پرندوں کی طرح دوڑ بھاگ، اُچک پھاند
اور اُڑان کی تیزی کو حاصلِ ترقیات اور خلاصۂ کمالات سمجھنے کی خصلت، اور ٹھیک وہی بے ہوشی اور
بے خبری اور اجنبیت فرشتوں کے نام سے، اللہ کے احکام سے، جنت کے ذکر سے، آخرت کی فکر سے۔

انجمن اسلامی تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کا

سلسلۂ مطبوعات

(۱) اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے | متکلم اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا بصیرت افروز مقالہ ضخامت ۴۰ صفحات قیمت صرف ۴ر

(۲) سائنس اور اسلام:- حضرت الحاج مولانا حافظ قاری محمد طیب صاحب کی معرکۃ الآراء تقریر ضخامت ۱۰۰ صفحات قیمت صرف ۶ر

(۳) فردوس گم گشتہ:- جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز کا جامع مقالہ

ضخامت ۴۲ صفحات قیمت صرف ۳ر

(۴) ایمان:- حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کی دلنشین تقریر۔

ضخامت ۴۰ صفحات قیمت صرف ۴ر

(۵) تمدن اسلام۔ کا پیام بیسویں صدی کی دنیا کے نام | مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا بصیرت افروز مقالہ ضخامت ۳۲ صفحات قیمت صرف ۳ر

(۶) تعلیم جدید پر ایک نظر روشن خیالوں کی نذر | جناب محمد صدیق میمن صاحب کا بصیرت افروز مقالہ ضخامت ۴۰ صفحات قیمت صرف ۳ر

(۷) کلمہ طیبہ:- از حضرت مولانا حافظ قاری محمد طاہر صاحب قاسمی۔

ضخامت ۲۰ صفحات قیمت صرف ۳ر

(۸) انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل | حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا دوسرا بصیرت افروز مقالہ ۔ ۳۲ صفحات قیمت صرف ۴ر

(۹) تمدن اسلام کی کہانی اسی کی زبانی | حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا دوسرا معرکۃ الآراء مقالہ ضخامت ۳۷ صفحات قیمت صرف ۴ر

ملنے کا پتہ:- معتمد نشر و اشاعت انجمن اسلامی تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ